*The Late Allama Barakat Ullah*

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ

# Eli Eli Lama Shabachtani

"My God, my God, why have you forsaken me?"

**A Reply to Objection Mullana Sana Ullah Amritsari**

By


**The Late Allama Barakat Ullah (M.A)**

Fellow of the Royal Asiatic Society London


# ایلی ایلی لما شبقتنی

یعنی

اے میرے خدا! اے میرے خدا تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

مصنفہ


علامہ برکت اللہ۔ایم۔اے

فیلو آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔لندن


**مصنف**

محمد عربی، کلمتہ اللہ تعلیم، نوری الہدیٰ، توضیح البیان فی اصول القرآن، دین فطرت اسلام یا مسیحیت؟ اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی؟ دشتِ کربلا یا کوہِ کلوری؟ صحتِ کتبِ مقدسہ، مسیحیت اور سائنس، مسیحیت کی عالمگیری، صلیب کے علمبردار، کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟ توراتِ موسوی اور محمد عربی، اصلیت وقدامت اناجیل اربعہ وغیرہ

1957

# یادگار

برادر خورد نعمت اللہ مینیجر اخبار اخوت۔ لاہور کی یادگار میں
آپ نے اپنی عمر گرانمایہ حق اور خدمت خلق خاطر وقف کردی
اور ۲۴ فروی ۱۹۰۷ء خداوند کے دن علے الصبح
خداوند میں آرام سے سوگئے۔

برکت اللہ

# دیباچہ طبع اول

آیہ شریفہ ایلی ایلی لما شبقتنی (اے میرے خدا! اے میرے خدا! تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا ؟) انجیل جلیل کی ان معدودہ چند آیات میں سے ہے جن پر مخالفین عموماً اعتراض کیا کرتے تھے ۔ پس ہم نے اس رسالہ میں اس آیت پر مفصل بحث کی ہے تا کہ ان معترضین کی تشفی خاطر ہوجائے جو صدقِ نیت سے اس کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ایسے ناظرین غور سے اس رسالہ کو پڑھ کر ان تمام حوالہ جات کا مطالعہ کرینگے جن کا ذکر دورانِ بحث میں کیا گیا ہے۔

ہم نے مولوی ثناء اللہ صاحب امر تسری کو اس رسالہ میں اپنا مخاطب بنایا ہے کیونکہ آپ کو شمالی ہند کے مسلمانوں میں خاص شہرت حاصل ہے اور پچاس سال سے زائد عرصہ سے میدانِ مناظرہ میں نبرد آزمائی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں۔" کہ میری عمر پچیس سال سے متجاوز تھی جب میں تحصیل علم سے فارغ ہو کر بالغ العلم ہوا اور ۱۸۹۲ء میں میری دستار بندی ہوئی تھی"۔ (اہلِ حدیث ۲۹ جنوری ۱۹۲۴ء)۔ ہم نے ایک شخص کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ جس کو مسلمان اپنا نمائندہ سمجھتے ہیں ۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم مولوی صاحب موصوف کو متلاشیانِ حق کے زمرہ میں نہیں پاتے کیونکہ ان کی کتاب "مسیحیت اور اسلام" میں جس کا اس رسالہ میں جا بجا حوالہ دیا گیا ہے) ہم کو تلاشِ حق کی تڑپ نظر نہیں آتی ۔ پس اگرچہ وہ متلاشیانِ حق کی صحیح معنی میں ترجمانی نہیں کرتے اور نہ کرسکتے ہیں تاہم وہ مناظرانہ رنگ میں آیہ کریمہ پر مختلف پہلوؤں سے اعتراض کرتے ہیں اور ان کے اعتراضات کا تسلی بخش جواب حق کے متلاشی کے لئے کارآمد ہوسکتا ہے۔ پس گو ظاہر اطور پر ہمارے مخاطب مولوی صاحب موصوف ہیں تاہم ہمارا روئے سخن درحقیقت ایسے احباب کی طرف ہے جو جستجوئے حق میں سرگرداں ہیں۔

ہم دست بدُعا ہیں کہ مولوی صاحب بھی اس زمرہ میں شامل ہوجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دردِ دل سے بار بار ان کو توبہ کی دعوت دیتے ہیں تا کہ ع

زاں پیشتر کہ بانگ برآید ثنا نماند

مولوی صاحب حق کی جانب رجوع کریں اور منجئی عالمین کے قدموں میں آئیں جو "راہ حق اور زندگی ہے اور خاکسار کی طرح نجاتِ ابدی سے بہرمند ہوں۔

انارکلی۔ بٹالہ — احقر العباد

۱۵ نومبر ۱۹۴۵ء — برکت اللہ

# دیباچہ طبع ثانی

مولوی ثناء اللہ صاحب کی کتاب " اسلام اور مسیحیت " ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔ ہم نے اخبار اخوت لاہور میں اس کا جواب ۱۹۴۱ء میں لکھا اور اس کے جواب الجواب کا انتظار کرتے رہے لیکن مولوی صاحب نے مرتے دم تک چپ سادھ لی۔

چار سال تک انتظار کرنے کے بعد ہم نے اس رسالہ میں وہ تمام مضامین شائع کردئیے جن کا تعلق مرقس ۱۵: ۳۴ سے تھا۔ مولوی صاحب ابھی زندہ تھے لیکن ان سے اس رسالہ کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اب ۱۹۵۷ء میں اس کی دوسری ایڈیشن شائع کی جاتی ہے۔ اس ایڈیشن سے وہ تمام مقامات خارج کردئے گئے ہیں جن کا تعلق مرحوم کی شخصیت سے تھا۔

میری دعا ہے کہ یہ رسالہ ان سب کو ابنِ اللہ کی صلیب کے نزدیک لے آئے جو حق کی تلاش میں سرگرداں ہیں تا کہ وہ بھی میری طرح نجاتِ ابدی سے بہرور ہوجائیں۔

ہنری مارٹن اسکول۔ علی گڑھ

۲۵ مارچ ۱۹۵۷ء

برکت اللہ

# باب اول
# مخالفین کے اعتراضات

مقدس مرقس کی انجیل میں وارد ہے :

جب دوپہر ہوئی تو تمام ملک میں اندھیرا چھا گیا اور تیسرے پہر تک رہا تیسرے پہر کو سیدنا عیسیٰ بڑی آواز سے چلائے کہ الوہی الوہی لما شبقتنی ؟ جس کا ترجمہ ہے اے میرے خدا اے میرے خدا آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ جو پاس کھڑے تھے ان میں سے بعض نے یہ سن کر کہا دیکھو وہ الیاس کو بلاتے ہیں۔ ایک نے دوڑ کر سپنج کو سرکہ میں ڈبویا اور سر کنڈے پر رکھ کر آپ کو چسایا اور کہا ٹھہر جاؤ۔ دیکھیں تو الیاس انہیں اتارنے آتا ہیں یا نہیں۔ پھر سیدنا عیسیٰ نے بڑی آواز سے چلا کر دم دے دیا۔ بیت اللہ کا پردہ اوپر سے نیچے تک پھٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا۔صوبہ دار آپ کے سامنے کھڑا تھا اس نے آپ کو یوں دم دیتے ہوئے دیکھ کر کہا بے شک یہ آدمی خدا کا بیٹا ہے۔

( مرقس ۱۵ : ۳۳تا ۳۹)

مذکورہ بالاآیات کی بنا پر انجیل جلیل کے بعض مخالفین اعتراض کرکے ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ سیدنا مسیح کو خدا نے صلیب پر چھوڑ دیا تھا اورآپ جانکنی کی حالت میں الہٰی رفاقت سے محروم تھے۔

ایک اور اعتراض یہ کیا جاتاہے کہ چونکہ منجئی کونین کوخود آخری دم قرُبتِ خداوندی حاصل نہ تھی آپ کی مبارک موت بنی آدم کی نجات کاوسیلہ نہیں ہوسکتی اور نہ آپ خدا کا مظہر ہوسکتے ہیں ۔ پس مسیحی مسئلہ نجات اور مسئلہ تجسم باطل ہیں۔

مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم نے مذکورہ بالا اعتراضات اپنی کتاب" اسلام اور مسیحیت" میں نہایت گستاخانہ الفاظ میں بڑی بے باکی سے کئے ہیں۔ بمصداق " نقلِ کُفر کُفر نہ باشند" ہم ان کے عامیانہ اور سوقیانہ الفاظ کوذیل میں نقل کرتے ہیں :

"ایک طرف تو مسیح کی شخصیت کو خدائے مجسم بتایا جاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سب قدرتوں اور طاقتوں کا مالک ہے اُدھر اس کو دشمنوں کے ہاتھوں چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح سولی پر چڑھایا جاتا ہے جس پر یہ صادق آتا ہے کہ سپنے اندر راجہ بھئو جاگت بھئو کنگال۔ مسیح اس عاجزانہ حالت میں صلیب پر لٹکے گویا یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کردیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے"(صفحہ ۱۰۳ )

" غالب علی الکل ہونا خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے اور غیر منفک ہے یعنی کسی وقت یا کسی آن میں یہ غلبہ اس کی ذات سے علیحدہ نہیں ہوسکتا ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اسیر ہوا۔ کانٹوں کا تاج پہنایا گیا ۔ اس کی پسلی میں بھالامارا گیا۔ آخر اس نے ایلی ایلی لما شبقتنی کہتے ہوئے سولی پر چلا کر جان دی۔" (صفحہ ۶۸ )۔

" دنیا کی تاریخی کُتب اور مسیحی اناجیل بالاتفاق شہادت دیتی ہیں کہ یہود مسیح کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کر آپ کو صلیب پر چڑھادیا اور ہاتھوں میں میخیں گاڑدیں۔ اس حالت میں یسوع مسیح کی یہ

فریاد کہ اے میرے خدا اے میرے خدا تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا آپ کا صحیح مقام عبودیت متعین کرنے کے لئے ایک فیصلہ کن جملہ ہے"۔

" مسیحیت نے دنیا کے بہت بڑے معزز اور خدا کے مقرب اور معصوم ناکردہ گناہ بندے کو پھانسی پر چڑھا کر گنہگاروں کی نجات ک ذریعہ سمجھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کو نہ تو عدل وانصاف کا اصول مانع آیا اور نہ خدا کے رحم نے اس کو اس ظلم سے باز رکھا۔"

"ہمارے دل میں یہ بات آئی ہے کہ ہم یسوع مسیح کے الہیٰ اوصاف کا نمونہ تصویر کی شکل میں دکھائیں۔ شاعر لوگ اپنے دلی جذبہ اور محبت اکثر اوقات لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ مگر گاہے گاہے مصوروں سے تصویر کشی کی درخواست کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں:۔

مصور کھینچ وہ نقشہ جس میں یہ رسائی ہو
ادھر تلوار کھینچی ہو ادھر گردن جھکائی ہو

اسی بنا پر ہم بادل ناخواستہ بقول نصاریٰ مسیح کی شخصیت الہیٰ کا خوفناک انجام تصویر میں دکھاتے ہیں۔ مسلمان ناظرین ہمیں معاف رکھیں کیونکہ مکروہ فعل کا ارتکاب کررہے ہیں۔ انجیل متی میں لکھاہے کہ یسوع مسیح کو صلیب پر چڑھایا گیا۔ اس کے ہاتھوں کوتختے کے بالائی حصہ کے ساتھ ملا کر میخیں گاڑی گئیں اوراس کے سر پر کانٹوں کا تاج پہنایا گیا۔ اس حالت میں اس نے نہایت عاجزی وزاری کے ساتھ چلا کر جان دی۔ جس کا نقشہ اگلے صفحے کی تصویر دیکھنے سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے۔"

اس عبارت کے بعد مولوی صاحب نے ایک نہایت کریہہ النظر تصویر کھینچ کر اس کے اوپرلکھاہے" اے میرے خدا ! اے میرے خدا ! تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا (مقولہ درانجیل) " اور تصویر کے نیچے مصرعہ لکھاہے۔ ع

دیکھے مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہے

اور پھر لکھتے ہیں کہ " باانصاف ناظرین اگراس تصویر کو غور سے ملاحظہ فرمائینگے تو ہماری اس آواز سے متفق ہونگے کہ ہم حسب مضمون آیہ کریمہ لااحب الا افلین ایسی کمزور شخصیت کو خدائی کے لئے پسند نہیں کرسکتے بلکہ ہمارا یقین ہے کہ کوئی بھی اہلِ بصیرت اس کو پسند نہیں کریگا۔" (اسلام اور مسیحیت صفحہ ۱۳۱، ۱۳۵، ۱۰۷، تا ۱۱۰)۔

" ہم نے اپنی کتاب اسلام اور مسیحیت میں مسیح کی تصویر کے اُوپر جو فقرہ نقل کیا تھا اس سے ہماری جو غرض تھی اسے ہم منطقی اصلاح میں بتاتے ہیں۔ عیسائیوں کا مسلمہ عقیدہ یہ ہے کہ خدا اور مسیح میں غیر منفک اتصال چلاآیا ہے۔ یہ مفہوم قضیہ دائمہ مطلقہ ہے ۔ ہم نے یہ فقرہ نقل کرکے قضیہ دائمہ مطلقہ عامہ کا ثبوت دیا تھا جو دائمہ مطلقہ کی نقیض ہے۔ آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ ذاتِ الوہیت سے مسیح کا اتصال دائمہ مطلقہ کی صورت میں ثابت نہیں ہے اس کے برعکس قضیہ مطلقہ عامہ کی شکل میں ثابت ہے جو پہلے قضیہ کی نقیض ہے"(اہلِ حدیث بابت ماہ جون ۱۹۴۲ء)

" مسیح کے اس مقولہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ الوہیت اور ذاتِ مسیح میں لزوم کی نسبت نہ تھی بلکہ ذاتِ الوہیت معاذ اللہ اس شعر کی مصداق تھی۔

سیاہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انسان سے

(اہلِ حدیث ۶ فروری ۱۹۴۲ء)

## مولوی ثناء اللہ توہین مسیح کے مرتکب

مولوی صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے کہ اُن کے زعم میں اس آیہ شریفہ سے ابنِ اللہ کی " عاجزی وزاری" (اسلام اور مسیحیت صفحہ ۱۰۸ وغیرہ) ثابت ہوتی ہے ۔ اس آیت کی آڑمیں آپ آنخداوند مسیح کی توہین اور تضحیک کرنے سے ذرا نہیں جھجکے ۔ (صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۳)۔ آپ کے اس اوچھے ہتھیار پر مرزائی تک ( جن کو مولوی صاحب ہمیشہ گمراہ کن اور گمراہ شدہ مانتے رہے) انگشت بدنداں ہیں۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب اردو ریویو آف ریلجنس قادیان آپ کی کتاب پر ریویو کرکے لکھتے ہیں:

" حضرت مسیح موعود علیہ الصلواۃ والسلام (یعنی آنجہانی مرزا صاحب قادیانی ) نے دریدہ دہن پادریوں اور عیسائی مناظرین کے اسلام اور آنحضرت ﷺ پر ناپاک اعتراضات کا الزامی جواب دینے کے لئے جو بائبل اور عیسائیوں کی دیگر تصانیف سے سیدنا عیسیٰ مسیح کی سخت قابل اعتراض شخصیت کو پیش کیا تو مولوی ثناء اللہ صاحب اوران کی قماش کے دیگر مولویوں نے آسمان پر اٹھا لیا کہ دیکھو مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کردی۔ لیکن آج مولوی صاحب ایک عیسائی کی کتابوں کا جواب لکھنا پڑا تو آپ نے وہی رنگ اختیار کیا جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوا السلام (یعنی مرزا صاحب) نے اختیار فرمایا تھا۔ چنانچہ سیدنا عیسیٰ مسیح کے اوصاف کا نمونہ الفاظ کی شکل میں آپ نے کتاب کے صفحہ ۵۵ سے صفحہ ۱۱۳ تک خوب دکھایا ہے پھر اسی پر بس نہ کرتے ہوئے آپ نے اسے تصویر کی شکل میں دکھانا بھی ضروری سمجھا۔ اور صفحہ ۱۰۹ پر حضرت سیدنا عیسیٰ مسیح کو صلیب پر لٹکتا ہوا دکھایا ہے اور نیچے کسی قدر تصرف کرکے غالب کا یہ مصرعہ لکھا ہے۔

دیکھے مجھے دیدہ عبرت نگاہ ہو

اور اس طرح بقول خود" ایک مکروہ فعل کا ارتکاب کیا"۔ (صفحہ ۵۵ بابت فروری ۱۹۴۲ء)

ہم ان کریہہ النظر شت رو تصویر بنانے والے وہابی مولوی صاحب کی ذہینیت پر حیران ہیں۔ آپ اپنی کتاب پر نازاں ہو کر کہتے ہیں"۔ میں اپنے دلی خیال کا اظہار کرتا ہوں کہ اپنی جملہ تصنیفات میں سے دو کتابوں کی نسبت مجھے زیادہ یقین ہے کہ خدا ان کو میری نجات کا ذریعہ بنائیگا۔ ان میں سے ایک کتاب" مقدس رسول" ہے جو رنگیلا رسول" کے جواب میں ہے۔ دوسری کتاب یہی" اسلام اور مسیحیت" ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں۔

روزِ قیامت ہر کسے دردست گیرد نامہ
من نیز حاضر مے شوم تائید قرآں در بغل (صفحہ الف)

لیکن جہاں تک توہین، تضحیک اور تمسخر کا تعلق ہے مرحوم کی کتاب اس رسوائے عالم کتاب" رنگیلا رسول" سے کم نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولویوں نے ایک مصنف پر" شاتم رسول" کا فتویٰ دے کر مسلمانوں کو اس قدر برافروختہ کردیا کہ وہ قتل کردیا گیا۔ لیکن مسیحی کلیسیا کلمتہ اللہ کی تعلیم اور نمونہ پر چل کر اس قسم کا وطیرہ اختیار نہیں کرتی۔ آپ جیسے مولویوں کی ناپاک کوششوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں میں (جن کی بموجب آیہ قرآنی ولتجدن اقرب همہ مودۃ للذین آمنوا الذین قالو انا نصاریٰ - دوستی کے لحاظ سے قریب ترین ہونا چاہیے تھا۔ سورہ مائدہ صفحہ ۸۵)۔ ایسا افتراق پیدا کردیا ہے کہ مسلمان حضرت روح اللہ کی شان کے خلاف توہین و تمسخر کے کلمات سن کر نہ صرف ٹس سے مس نہیں ہوتے بلکہ الٹا خوش ہو کر ایسے ایمان فروش مولویوں کو قائد مانتے ہیں۔ اس قسم کے حضرات دعوےٰ کرتے ہیں " تائید قرآن" کا جو فرماتا ہے ۔" اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور قرآن جو ہم پر اترا۔ اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کے بارہ بیٹوں پر نازل ہوا اور اس کتاب پر جو موسیٰ اور عیسیٰ کو ملی اور جو دوسرے نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملا۔ ہم ان کے درمیان کسی بھی کسی طرح کا فرق نہیں کرتے اور ہم اسی ایک خدا کے مطیع ہیں۔"(بقرہ ۱۳۰، ۲۵۸، عمران ۷۸)۔ ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ مسیح کی توہین کرنے سے محمد کی تعظیم نہیں کرتے بلکہ اس کی، اس کے اللہ کی اور اس کی کتاب کی بھی توہین کرتے ہیں؟ مرحوم اپنی کتاب کے سرورق کو قرآنی آیت لا تجادلو اھل الکتاب الا بالتی احسن سے مزین کرکے اپنی تمہید میں لکھتے ہیں کہ" خدا نے ہدایت فرمائی ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ بہترین طریق سے مناظرہ کیا کرو"(صفحہ ۱۲) لیکن ان کے توہین و تضحیک آمیز الفاظ اس قرآنی آیہ کے ضد ہیں۔ اس قسم کے علماء حضرت روح اللہ کی توہین کرکے قرآن اور اسوہ حسنہ کو ترک کرنے اور اہلِ یہود کی جمعیت العلما کے زمرہ میں شامل ہونے کے جرُم کے مرتکب ہوتے ہیں ۔(متی ۲۷: ۳۹ تا ۴۵)۔ حق تو یہ ہے کہ

آنخداوند کا تمسخر اور مضحکہ کرکے وہ مومنین کے گروہ سے نکل کریہودی کاہنوں ، فقیہوں ، مجرم مصلوبوں بلکہ بُت پرست رومی سپاہیوں کے زمرہ میں جاشامل ہوتے ہیں۔ فاعتبرو یا الوالالباب

ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اس قسم کے بے باک معترض بھول جاتے ہیں کہ " اہل یہود پر اُن کے کفُر کی وجہ سے خدا کی پھٹکار اور لعنت ہے"۔ (نساء آیت ۲۴) اور کہ " اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان پر اپنا غضب نازل کیا اور ان میں سے بعض کو بندر اور سور بنادیا"۔(مائدہ ۶۵) وہ ایسوں کی پیروی کرکے " قسی القلب" (مائدہ آیت ۱۲) ہوجاتے ہیں۔ اوران "ناخلف" (مریم ۶۰ ، اعراف ۱۶۸) یہود کے زمرہ میں داخل ہو کر وجیھاً فی الد نیا والاخرۃ کی توہین کرکے اپنی آخرت کو خراب کرلیتے ہیں۔ اس قماش کے لوگ حشر کے روز اس قسم کی توہین آمیز کتاب" بغل" میں لے کر ایک عادل داور کے حضور حاضر ہونے کی جرات کس طرح کرسکینگے ؟

## مولوی ثناء اللہ صاحب کا مناظرانہ رنگ

مولوی صاحب کی کتاب" اسلام اور مسیحیت "کا مطالعہ ثابت کردیتا ہے کہ آپ مناظرہ کو تلاش حق کا وسیلہ خیال نہیں فرماتے تھے۔ ہاں چند اعتراضات اوردلائل آپ نے رٹ رکھے تھے۔ جو وقت بے وقت ، جا اور بے جا آپ اپنی تقریرو تحریر میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ مرحوم کو اقبال بھی ہے کہ خاکسار کتابوں میں بحث " نرالے طرز" پر" بصورت جدید" کی گئی ہے بقول حضرت خوش

ع نرالی بحث چھڑی تھی نیا مقابلہ تھا

لیکن جب آپ جواب لکھنے بیٹھے تو وہی پرانے ملانوں کے دقیانوسی اعتراضات جو آپ نے ایامِ جوانی میں سیکھے تھے طوطے کی طرح پڑھ کر سنائے ۔ چنانچہ قادیانی ریویو بھی اس بات کا شاکی ہےاور کہتا ہے کہ " پادری صاحب اندازِ بیان مختلف تھا اس لئے ضروری تھا کہ ان کے جواب میں بھی اسی انداز کو اختیار کیا جاتا۔ لیکن مولوی صاحب کا اندازوہی قدیم مناظرانہ ہے جس کے بیان میں کوئی ندرت نہیں"۔ (فروری ۱۹۴۲ء صفحہ ۵۲)۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگوئم

## واقعہ صلیبِ مسیح اور قرآن

لیکن اس سے قبل کہ ہم مولوی صاحب کے اعتراضات کا جواب دیں ہم مولوی صاحب سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں جس کے جواب پران کے اپنے دین وایمان کا مدار ہے۔ آپ نے بالکل سچ فرمایا ہے کہ " دنیا کی تاریخی کتب اور مسیحی اناجیل بالاتفاق شہادت دیتی ہیں کہ یہود مسیح کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کرآپ کو صلیب پر چڑھادیا"(اسلام اور مسیحیت صفحہ ۱۳۱)۔

یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ آپ کو اس بات کا اقبال ہے کہ مسیح کا صلیب پر چڑھایا جانا ایک حقیقی اور سچا تاریخی واقعہ ہے کیونکہ بالفاظِ شما" دنیا کی تاریخی کُتب اور مسیحی اناجیل بالاتفاق شہادت دیتی ہیں" کہ یہ واقعہ کوئی من گھڑت افسانہ نہیں اور اس امر میں ان لوگوں کو جو واقعہ صلیب کے موقعہ پر حاضر تھے نہ تو قوتِ متخیلہ نے فریب دیا تھا اور نہ کوئی شخص وہم اورشبہ میں گرفتار ہوا تھا۔ بلکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کو ماننے والے گمان اورظن کی پیروی نہیں کرتے بلکہ حق بات کہتے ہیں ۔لیکن قرآن " دنیا کی تاریخی " کُتب اور مسیحی اناجیل کی متفقہ شہادت" کے خلاف کہتا ہے" یہودکہتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم رسول اللہ کو قتل کردیا حالانکہ نہ اسے قتل کیا اور نہ اسے صلیب دی۔ لیکن وہ شبہ میں پڑگئے اور وہ جو اس کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں ان کی نسبت شک میں ہیں کہ ان کو اس کا علم نہیں لیکن وہ گمان کی پیروی کرتے ہیں اوریقیناً اس کو قتل نہیں بلکہ اسے خدا نے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ غالبِ حکمت والاہے"۔(سورہ نساء آیت ۱۵۶)۔

پس قرآن " دنیا کی تاریخی اور مسیحی اناجیل کی متفقہ شہادت" کے عین ضدواقعہ صلیب کا انکار کرتا ہے۔ چونکہ علم منطق کے روسے اجتماع الضدین محالات میں سے ہے۔ پس یا تو" دنیا کی تاریخی کُتب اور مسیحی اناجیل کی متفقہ شہادت سچی ہے یا قرآن کی شہادت سچی ہے۔ بصورت اول آپ قرآن اور اپنے ایمان کا انکار کریں گے اور بصورت دوم دنیا کی تاریخی کُتب کی شہادت کو کاذب سمجھیں گے۔

مصیبت میں پڑا ہے سینے والا چاک داماں کا

جو یہ ٹانکا تو وہ ادھڑا جو وہ ٹانکا تو یہ ادھڑا

دیکھیں مرحوم مولوی صاحب کے ہم خیال اصحاب کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اور کون سی راہِ فرار تجویز فرماتے ہیں۔

# باب دوم

# مولوی ثناء اللہ صاحب کے اعتراضات کی خامی

## مولوی ثناء اللہ صاحب کی تفسیر

مرحوم مولوی صاحب آیت زیر بحث کو ابن اللہ سے منسوب کرکے اپنا خاص الخاص اعتراض اپنے مخصوص انداز میں بایں الفاظ کرتے ہیں:

مسیح کے اس مقولہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ الوہیت اور ذات مسیح میں لزوم کی نسبت نہ تھی۔ بلکہ ذاتِ الوہیت معاذ اللہ اس شعر کی مصداق تھی۔

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے

کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انسان سے"

(اہلِ حدیث ۶ فروری ۱۹۴۲ء)

اس تمام مضمون کا اور مندرجہ بالا اعتراض کا جو بتکرار پیش کیا گیا ہے ماحصل یہ ہے کہ یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ خدا اور مسیح میں انفکاک اور علیحدگی تھی۔ یعنی خدا مسیح سے جدا تھا اور اس نے مسیح کو ترک کردیا تھا۔

## مولوی صاحب کی اخفائے حق کی کوشش

ہمیں افسوس ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کا یہ اعتراض نہ صرف ان کی مناظرانہ حیثیت کو بٹہ لگاتا ہے بلکہ اخلاقی پہلو سے بھی قابلِ گرفت ہے۔ آپ نے اپنی کتاب اور اپنے اخبار اہلِ حدیث کے مضمون میں جس جس جگہ زیر بحث آیت کا ذکر کیا ہے آپ نے اپنے ناظرین پر یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ یہ کلمہ (اے میرے خدا، اے میرے خدا تونے مجھے کیوں چھوڑ

دیا؟) ابن اللہ کا اپنا " مقولہ " ہے جو آپ کے مافی الضمیر کا اظہار کرتاہے۔ حالانکہ یہ کلمہ آنخداوند کا اپنا مقولہ نہیں۔ بلکہ یہ آیت بائیسویں زبور کی پہلی آیت ہے جس کو آپ نے صلیب پر سے اس مزمور کا عبرانی زبان میں اقتباس کرکے تلاوت فرمایا۔ پس مولوی صاحب مرحوم اس مقام پر اخفائے حق کے مُرتکب ہوئے ہیں اور یہ حرکت آپ سے سہواً صادر نہیں ہوئی بلکہ آپ نے دیدہ دانستہ کی ہے کیونکہ :

اول۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ صحفِ مقدسہ سے بخوبی واقف ہیں۔ لہذا آپ کو یہ ضرور معلوم ہوگا کہ جو کلمہ اس آیہ شریفہ میں ہے وہ ابنِ اللہ کا اپنا مقولہ نہیں بلکہ بائیسویں زبور کی پہلی آیت ہے۔

دوم۔ بفرضِ محال اگر آپ کو یہ علم نہیں تھا تو جس انجیل کے صفحہ پر سے آپ نے اس آیت کو نقل کیا تھا اس صفحہ کے حاشیہ نے آپ کو بتلادیا ہوگا کہ یہ آیت محض ایک اقتباس ہے جو بائیسویں زبور کی پہلی آیت ہے۔

سوم۔ آپ کو انجیل جلیل کے متعلق ہمہ دانی کا دعویٰ ہے۔ (کتاب اسلام اور مسیحیت صفحہ ۳۸) پس آپ کم از کم اس امر سے (جس کو مسیحی کلیسیا کا بچہ بچہ جانتا ہے ) ضرور واقف ہوں گے کہ ابنِ اللہ نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے کبھی خدا" یا اے میرے خدا " نہیں کہا۔ بلکہ آپ ہمیشہ خدا کو " ابا " ۔ (مرقس ۱۴: ۳۰)۔ " اے میرے باپ " ، "میرا باپ "، " میرا آسمانی باپ"، (متی ۱۱: ۲۵۔ مرقس ۱۳: ۳۲، متی ۷: ۲۱۔ ۱۰: ۳۲۔ لوقا ۲: ۴۹، متی ۱۶: ۱۷، ۱۸: ۱۰۔ متی ۱۸: ۳۵ وغیرہ وغیرہ)۔ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اپنی زندگی کی آخری رات آپ نے جو دعا مانگی اس میں بھی خدا کو" اے باپ" ہی کہا (یوحنا ۱۷ : باب) بلکہ صلیب پر سے آپ نے جو سات کلمات اپنی مبارک زبان سے فرمائے ان میں سے پہلے اور آخری کلمے (جس کے بعد ہی آپ نے دم دے دیا) میں آپ نے خدا کو مخاطب کرکے" اے باپ" ہی کہا (لوقا ۲۳: ۳۴، ۴۲)۔ پس مولوی صاحب نے انجیل متی میں ایلی ایلی لما شبقتنی " پڑھا تو آپ جیسے نکتہ رس شخص کیوں نہ چونک پڑے کہ اس خاص مقام میں سیدنا مسیح " ابا" کے بجائے "ایلی ایلی " کیوں کہتے ہیں ؟ اگر آپ نے دریافت کرنے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو آپ پر یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ مقولہ ابنِ اللہ کا نہیں بلکہ آپ زبور شریف کی آیت کی تلاوت فرمارہے تھے۔

سیدنا مسیح کے صلیب پر کے پہلے اور آخری کلمات کے الفاظ (لوقا ۲۳: ۳۴، ۴۲) ہی ایسے چونکادینے والے ہیں کہ ہر صاحب عقل پر یہ فوراً ظاہر ہوجاتاہے کہ یہ مقولے سیدنا مسیح کے ہیں لیکن آیہ زیر بحث اس قسم کی طبعیت رکھنے والے انسان کی روحانی حالت کی ترجمان نہیں ہوسکتی اور یہ کہ حضرت کلمتہ اللہ کا " مقولہ" نہیں بلکہ زبور کی آیت ہے جو آپ تلاوت فرمارہے تھے۔

چہارم۔آپ جیسے انجیل دان سے یہ مخفی نہ ہوگا کہ ابنِ اللہ کی مادری زبان عبرانی نہیں بلکہ ارامی زبان تھی۔(مرقس ۵: ۴۱۔ ۷: ۳۴، ۱۴: ۳۶ وغیرہ) پس جب آپ نے انجیل متی میں پڑھا کہ ابنِ اللہ نے صلیب پر سے عبرانی زبان میں ایک کلمہ فرمایا تو اگر آپ نے وجہ دریافت کی ہوتی تو آپ کو معلوم ہوجاتا کہ جس طرح ہندوستان کا کوئی مومن مسلمان حالت نزع میں قرآنی سورہ یسٰین کی آیات عربی زبان میں تلاوت کرتا ہے اسی طرح ابن اللہ نے بھی جانکنی کی حالت میں بائیسویں زبور کی پہلی آیت زبور شریف کی اصل زبان عبرانی میں تلاوت فرمائی تھی۔

پنجم۔ ممکن ہے کہ باوجود دعویٰ ہمہ دانی (صفحہ ۳۸) آپ یہ عذر لنگ پیش کریں کہ آپ کو یہ علم ہی نہ تھا کہ ابن اللہ کی مادری زبان آرامی تھی لیکن آپ کو کم از کم زبان عربی کی تاریخ اور اسلامی تاریخ سے تو واقفیت تھی۔ کیونکہ آپ بڑے مولوی اور " مولوی فاضل " بھی تھے۔ آپ کی کتاب نے تو یہ ظاہر کردیا کہ مسیحی کلیسیا کی تاریخ کے متعلق آپ کے ماخذ صرف بچوں کے ابتدائی مدارج کی کُتب ہی ہیں(صفحہ ۴۵، ۴۶) لیکن عربی دانی کا تو یہ حال نہیں ہوناچاہیے تھا کہ ارض مقدس میں عربی زبان کی آمد سے پہلے ارامی زبان رائج تھی جس کی جگہ عربی نے لے لی تھی۔

یہ زبان بابل کی زبان تھی جو کنعان میں اہلِ یہود کےساتھ آئی تھی۔ اہل یہود کی کُتُبِ مقدسہ کے تراجم اور تفاسیر جن کو " تارگم" کہتے ہیں ۔ اسی زبان میں منجئی عالمین کی بعثت سے ایک صدی پہلے اورایک صدی بعد کے دوران لکھے گئے تھے۔ یہی زبان حضرت کلمتہ اللہ اور آپ کے رسولوں کی مادری زبان تھی۔ دسویں صدی مسیحی تک اہل یہود اسی زبان میں کتابیں لکھا کرتے تھے۔ یہ زبان تمام پارتھی سلطنت میں بولی جاتی تھی جس کی حدود دریائے سندھ سے دریائے فرات تک اور بحرہند سے بحر کیسپین اور کوہ ہندوکش تک تھیں۔ یہ زبان اس قدر وسیع رقبہ اور دور دراز کے ممالک میں بولی جاتی تھیں کہ مورخ یوسیفس نے اپنی کتاب پہلے ارامی زبان میں تصنیف کی تھی تاکہ " بابل کے ملک کے رہنے والے اور عرب کے دور افتادہ باشندے اور فرات کے پار رہنے والے یہودی اور پارتھی" اس کی کتاب کو پڑھ سکیں ۔ بعد میں یوسیفس نےاس کتاب کو یونانی زبان میں " ان لوگوں کی خاطر جو رومی سلطنت میں رہتے ہیں" ترجمہ کیا تھا[1] ۔

عرب کی فتوحات سے ایک ہزار سال پہلے مشرق میں یہی ارامی زبان مہذب دنیا کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ حتیٰ کے ایران جیسے دور دراز ملک میں بھی ایرانی زبان کی بجائے ارامی زبان ہی تصنیف وتالیف کا ذریعہ تھی۔ لیکن اسلامی فتوحات نے یہ نقشہ بدل دیا اور عربی نے ارامی زبان پر غلبہ حاصل کرلیا۔ پس آپ کو اس بات سے ناواقف نہیں ہونا چاہیے تھا کہ ابن اللہ کی مادری زبان ارامی تھی اور عبرانی فقرہ جوآپ کی زبان مبارک سے نکلاوہ زبور شریف کی اصل زبان عبرانی کا اقتباس تھا۔

وجوہِ بالا کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اخفائے حق کے عمداً مُرتکب ہوئے ہیں۔ کیونکہ گوآپ کو خود معلوم تھا کہ یہ عبرانی کلمہ بائیسویں زبور کا حصہ ہے لیکن آپ نے ہر جگہ اپنے ناظرین پر یہی ظاہر کیاہے کہ کلمہ خود ابن اللہ کا اپنا" مقولہ" ہے جو ان کے خیالات وجذبات کا مظہر ہے اوریوں آپ نے لوگوں کودیدہ ودانستہ گمراہ کیا۔ ہر صحیح العقل شخص ایک قائل کے اپنے قول اور کسی دوسرے کے کلام میں جس کا اس نے اقتباس کیا ہو تمیز کرسکتا ہے اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں تمیز کرتاہے۔ مثلاً اگر زید کسی کو بتلائے کہ بکر نے حالت نزع میں سورہ یٰسین کی آیت پڑھی إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلاَلاً فَهِيَ إِلَى الأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ ترجمہ: یعنی ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں اور وہ ٹھوڑیوں تک پھنسے ہوئے ہیں تو ان کے سرافل کر رہ گئے ہیں"(سورہ یسین ۷ ترجمہ نذیر احمد) توکوئی عقل اور سمجھ رکھنے والاشخص اس عربی کلام کو بکر سے منسوب کرکے نہیں کہیگا کہ یہ کلام بکر کااپنا کلام ہے۔ بلکہ ہر شخص جس کے سر میں دماغ اور دماغ میں عقل ہے یہی کہیگا کہ یہ عربی کلام قرآنی آیت ہے جس کو بکر بحالت نزع تلاوت کررہا تھا۔ ایک اورمثال سے ہم اس امر کو واضح کردیتے ہیں۔ قریش قرآن جو جھٹلا کرکہتے تھے کہ قرآن " پریشان خوابوں کا مجموعہ" ہے(انبیاء ۵آیت) اوروہ " پہلے لوگوں کی کہانیاں" ہے۔ تب حضرت نے بارگاہ الہٰی میں فریاد کرکے کہا تھا۔ " یا اللہ میری قوم نے قرآن کو ٹھہرایا جھک جھک" (فرقان آیت ۳۲) اب معترض کی سی عقل کے مالک ہی یہ کہینگے کہ رسول عربی کا یہ مقولہ ہے کہ قرآن محض جھک جھک ہے۔ لیکن ہر صاحبِ ہوش یہی کہیگا کہ

ع بریں عقل ودانش بباید گریست

پس آپ نے اپنے مفروضہ (کہ آیت زیر بحث ابن اللہ کا اپنامقولہ ہے) کی بناء پر جو منطقیانہ استدلال کی عمارت کھڑی کی ہے (اسلام اور مسیحیت صفحہ ۶۸ ۔ اہل حدیث بابت ۶ فروری ۱۹۴۲ ء صفحہ ۳، ۴ وغیرہ) وہ از سر تا پا بے بنیاد ہے۔ معترض سے تو یہودی ربی کلاسنر (Klausner) ہی اچھے رہے جو اپنی ضیغم کتاب " یسوع ناصری" میں اس کلمہ کی نسبت فرماتے ہیں کہ " یسوع صحفِ مقدسہ کی روح سے اس قدر معمور تھا کہ اس نے صلیب پر اپنی جان دیتے وقت بھی کتابِ مقدس کی آیت کی تلاوت کی"(Jesus of Nazareth) کاش کہ

---

[1] See Max Muller, Lectures on the Science of Language Vol.1 Lecture 8 and Josephus, Wars of the Jews.

معترض ان یہودیوں سے جن کو قرآن " ناخلف" اور " قسی القلب " وغیرہ کہتا ہے ۔ حق اور صداقت کا سبق سیکھ لیتے ۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال ایسے مومن مسلمان کی نسبت ہی فرماگئے ہیں ۔

ع　　　یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

کاش کہ مرحوم مولوی صاحب اخفائے حق سے یہ کام نہ لیتے اور جیتے جی خود اپنے فتویٰ کو یاد رکھتے کہ " مذہبی مناظرات میں جو خدا کی عدالت میں پیش ہوتے ہیں واقعات صحیحہ کا اخفا کسی طرح جائز نہیں ہے"۔صفحہ ۱۲ اور کہ منصف مزاج لوگ مذہبی مباحثات میں خاص کر اخفائے واقعات کرنا جرُم عظیم سمجھتے ہیں (صفحہ ۲۳) آپ نے اخفائے واقعات سے " کام لے کر ایک " جرم عظیم " کا ارتکاب کیا۔

## مولوی صاحب کی تفسیر صحیح اُصول کے خلاف

مرحوم مولوی صاحب کو تفسیر نویسی پر ناز تھا۔ اسی لئے بچارے خلیفہ قادیان کو آئے دن تفسیر نویسی کے لئے چیلنج بھی دیا کرتے تھے۔آپ نے ایک رسالہ " تفسیر بالرائے" لکھ کر اپنے مخالف " قادیانیوں، شیعوں، لاہوری مرزائیوں ، نیچری مسلمانوں " وغیرہ کو اُصولِ تفسیر کی تعلیم بھی دی ہے ۔ پس ہمیں تعجب آتا ہے کہ انجیل جلیل کی آیات کی تفسیر کرتے وقت انہوں نے صحیح اُصولِ تفسیر کو پس پُشت کیوں پھینک دیا؟

صحیح تفسیر کے لئے لازم ہے کہ (۱) کہ وہ کتاب اللہ کی آیات بینات کے خلاف نہ ہو اور کہ (۲) وہ قائل کے اصل مفہوم اور حقیقی منشا کے خلاف نہ ہو اور اس کے خیالات ، جذبات اور افعال کے منافی نہ ہو۔ ورنہ وہ تفسیر القول بما لایرضیٰ قائلہ متصور ہوگی۔اس کے برعکس لازم ہے کہ صحیح تاویل کہنے والے کے خیالات کا آئینہ ہو اور اس کے جذبات کی درست ترجمانی کرے اور اس کے اقوال وافعال کے مطابق ہو اور (۳) کتاب اللہ کی آیات اس تاویل کی مصدق ہوں۔

اگر مرحوم کی زیر بحث آیت کی تاویل درست ہے تو لازم تھا کہ وہ یہ ثابت کرتے کہ ان کی تاویل حضرت کلمتہ اللہ کے اصلی مفہوم اور حقیقی منشاء اور مافی الضمیر کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔(۲) کہ ابنِ اللہ کے خیالات، جذبات، اقوال وافعال جو اناجیل اربعہ میں پائے جاتے ہیں (بالخصوص وہ جن کا تعلق خداوند کی زندگی کے آخری ہفتہ کے ساتھ ہے)سب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ خدا نے مسیح کو ترکردیا تھا اور(۳)انجیل جلیل کی آیات اس بات کی بین شاہد ہیں کہ خدا مسیح سے جُدا تھا۔ کیونکہ اس نے آپ کو معاذاللہ رد کردیا تھا۔ اگر وہ یہ ثابت کرسکتے تو ہم بھی مان لیتے کہ تفسیر نویسی میں آپ بال کی کھال اتارنے والے ہیں"(صفحہ ۱۵) لیکن انجیل کی آیات بینات اور کلمتہ اللہ کے کلمات طیبات سے تو معترضین تاقیامت یہ ثابت نہیں کرسکتے ۔ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ وَلَن تَفْعَلُواْ فَاتَّقُواْ النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۔ پس اگر یہ نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکوگے تو دوزخ کی آگ سے ڈرو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اور وہ منکروں کے لئے تیار ہے (بقرہ آیت ۲۳)۔

## مولوی ثناء اللہ صاحب کی تفسیر اناجیل کے نقیض ہے

اناجیل اربعہ کا ایک ایک صفحہ اور ابن اللہ کی مبارک زندگی کا ایک ایک ورق مولوی صاحب مرحوم کی تفسیر کو غلط ثابت کرتا ہے۔چاروں انجیلوں کی ایک ایک آیت کی " بال کی کھال اتار" لو ۔ حضرت کلمتہ اللہ کے ارشادات اور کلمات طیبات کو ایک ایک کرکے چھان مارو۔ آپ کے خیالات جذبات اور افعال کو ایک ایک کرکے دیکھ لو تم کو کسی مقام پر یہ نہ ملیگا کہ خدا نے ابن اللہ کو ترک کردیا تھا۔ اس کے برعکس انجیل جلیل کی آیات بینات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آب اَور ابن میں " انفکاک اور جدائی " اور مغائرت کا نام ونشان بھی نہیں۔ اس کے برعکس ہر وقت اور ہر جگہ کامل اتصال رفاقت قُربت اور اتحاد نظر آتا ہے۔

## سیدنا مسیح کے اقوال

کسی نے خوب کہا ہے کہ من آنم کہ من دانم۔ اس معیار سے جب ہم ابن اللہ کے اقوال پر نظر کرتےہیں توہم کو یہی دکھائی دیتا ہے کہ خدامیں اور آپ میں رفاقت ، قربت ، اتحاد اور محبت کا رشتہ شروع سے آخری دم تک ہمیشہ قائم رہا۔ چنانچہ ابن اللہ فرماتے ہیں کہ باپ بیٹے سے محبت کرتا ہے ۔ اور اس کی عزت کرتاہے ۔(یوحنا ۳: ۳۵، ۱۴: ۲۱، ۵: ۲۰، ۸: ۵۴، ۱۰: ۱۷، ۱۵: ۱۹، ۱۷: ۲۶ اور " بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے"۔ (یوحنا ۱۵: ۱۰) " جو کچھ میرا ہے وہ باپ کا ہے ۔ اور وہ سب میرا ہے "(یوحنا ۱۶: ۱۵، ۱۷: ۱۰)۔ " میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کوئی بیٹے کونہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کہ اور اس کے جس پر بیٹا ظاہر کرنا چاہے"( متی ۱۱: ۲۷، لوقا ۱۰: ۲۲۔ یوحنا ۸: ۵۵، ۱۰: ۱۵)۔ آنخداوند فرماتے ہیں کہ " جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا۔" (یوحنا ۱۴: ۹) کیونکہ " میں اور باپ ایک ہیں"(یوحنا ۱۰: ۳۰)۔آپ نے فرمایا کہ باپ کی رفاقت اور اس کے کام کو پورا کرنا آپ کا "کھانا پینا" ہے (یوحنا ۴: ۳۲، ۵: ۳۰۔ ۶: ۳۸ ) اور کہ آپ خدا کی طرف سے آئے ہیں اورخدا کے پاس واپس لوٹ جائینگے (یوحنا ۷: ۲۹، ۷: ۳۳۔ ۸: ۲۳۔ ۱۶: ۲۸۔ ۲۰: ۱۷ وغیرہ)۔ کیا یہ الفاظ ( جن میں اکثر آپ نے اپنی زندگی کے آخری ہفتہ میں بلکہ آخری رات فرمائے تھے ) کسی ایسے شخص کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کو یہ خیال ہو کہ خدا اس سے ناراض ہے یا وہ مغضوبِ قہر الہیٰ ہے یا کہ خدا نے اس کو ترک کردیاہے؟

## اللہ تعالیٰ کی شہادت

اگر مولوی ثناء اللہ صاحب کے خیال میں ابن اللہ کے مندرجہ بالا کلمات ان کی تاویل کو مردہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں تووہ چونکہ قال اللہ اور اطیعوا اللہ کے ماننے والے ہیں اور اتمام حجت کی خاطر ان کی پاس خاطر ہمیں منظور ہے لہذا ہم ان کو بتلاتے ہیں کہ خود ارشادِ خداوندی ثابت کرتاہے کہ خدا نے ابنِ اللہ کو تمام عمر کبھی ترک نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس خدا نے " بنائے عالم سے پیشتر بیٹے سے محبت رکھی"( یوحنا ۱۷: ۲۴) جب کلمتہ اللہ مبعوث ہوئے تو الہیٰ ارشاد ہوا"۔ یہ میرا پیارا بیٹاہے جس سے میں خوش ہوں"( متی ۳: ۱۷)اس آیہ شریفہ کی بہترین تفسیر یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے ۴۲ باب کی پہلی چار آیات ہیں۔ صلیبی واقعہ سے چند ہفتے پہلے پھر الہیٰ ارشاد ہوتا ہے " یہ میرا پیارا بیٹاہے جس سے میں خوش ہوں ۔ اس کی سنو"( متی ۱۷: ۵) صلیب دئیے جانے سے چند ساعت پہلے ابنِ اللہ نے کہا " اب میری جان گھبراتی ہے پس میں کیا کہوں؟اے باپ !مجھے اس گھڑی سے بچا؟ لیکن میں تو اسی سبب سے اس گھڑی کو پہنچا ہوں ۔ اے باپ ! اپنے نام کو جلال دے ۔ پس آسمان سے آواز آئی کہ میں نے اس کو جلال دیا ہے اور پھر بھی دوں گا"( یوحنا ۱۲: ۲۷ تا ۲۸)۔ جن شاگردوں نے ان الہیٰ کلمات کو سنا وہ شہادت دیتےہیں کہ دوسروں کے ساتھ انہوں نے خدا کی یہ گواہی سنی تھی(۲ پطرس ۱: ۱۷)۔ اور مقدس یوحنا کہتا ہے کہ " خدا کی گواہی یہ ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کے حق میں گواہی دی ہے " (یوحنا ۵: ۹)خود ابنِ اللہ فرماتاہے کہ " باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اسی نے میری گواہی دی ہے"(یوحنا ۵: ۳۷) مولوی صاحب ۔ خدا سے بڑا تو کوئی گواہ نہیں ہے اور خدا کی گواہی آپ کی تاویل کو(کہ اس نے ابنِ اللہ کو ترک کردیا تھا) مردود قرار دیتی ہے۔

## ابنِ اللہ کا طرزِ عمل

ابنِ اللہ فرماتےہیں کہ آپ کی آمد کا واحد مقصد یہ ہے کہ آپ نے اپنے باپ کی مرضی کو پورا کریں اور اس کا کام سر انجام دیں جو باپ نے آپ کے سپرد کیاہے ۔(یوحنا ۴: ۳۴، ۵: ۳۰۔ ۶: ۳۸، ۱۲: ۴۹۔ ۱۵: ۱۰۔ مرقس ۱۴: ۳۶۔ متی ۲۶: ۳۹ تا ۴۲۔ لوقا ۲۲: ۴۲۔) آپ ہمیشہ اسی کام کو سر انجام دینے کی دھن میں رہتے تھے (یوحنا ۴: ۳۲تا ۳۴ ، ۹: ۴۔ ۱۴: ۳۱) اور اس کو پورا کرنے پر تلے تھے اور اس کی تکمیل میں سی

قسم کے خطرے کی پرواہ نہیں کرتے تھے( لوقا ۹: ۵۱- ۱۲: ۵۰) یہاں تک کہ آپ نے اس کام کو پورا کرکے چھوڑا (یوحنا ۷: ۱۲- ۸: ۲۹- ۹: ۴-۱۷: ۴- ۱۹: ۳۰) ابن اللہ کو خوب معلوم تھا کہ اس کو سرانجام دینے کی راہ میں اہل یہود کی روز افزوں بے ایمانی اور برگشتگی کی وجہ سے آپ کو انواع واقسام کی دقتوں اور دشواریوں کا جان توڑ مقابلہ کرنا ہوگا۔ آپ کے تجربہ نے آپ کو بتلایا دیا تھا کیا آپ کی قوم کے قائدوں اور سردار کاہنوں کی خصومت دن بدن ترقی کررہی ہے۔آپ نے انبیائے سلف اوراپنے ہم عصر نبی یوحنا بپتسمہ دینے والے کے انجام میں ( متی ۲۳: ۲۹- ۳۳: ۳۷- ۲۱: ۳۲-وغیرہ) دیکھ لیا تھا کہ آپ کا اپنا حشر کیا ہوگا (متی ۱۷: ۱۲تا۱۳) صحف مقدسہ کے مطالعہ سے (جیسا ہم اپنی کتاب " کلمتہ اللہ کی تعلیم" میں لکھ چکے ہیں) کلمتہ اللہ کو یقین ہوگیا تھا کہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے " خادمِ یہوواہ" کے تصور کے مصداق آپ ہی ہیں (لوقا ۲۲: ۳۷- ۴: ۲۱)لیکن یہ سب باتیں آپ کے پہاڑ جیسے زبردست اور مصمم ارادہ کو نہ بدل سکیں اورآپ نے یہ ٹھان لی کہ ہرچہ بادا باد آپ اس کام کو پورا کرکے چھوڑیں گے جس کے واسطے باپ نے آپ کو دنیا میں بھیجا تھا(متی ۲۰: ۲۸- مرقس ۱۰: ۴۵)خواہ ایسا کرنے میں آپ کو اپنی جانِ عزیز بھی قربان کرنی پڑے (یوحنا ۱۰ باب) پس آپ نے اپنی اذیت اور مصلوب ہونے کی بابت اپنے شاگردوں کو اطلاع دی (متی ۱۶: ۲۱- ۱۷: ۹، ۱۲، ۲۲، ۲۳و ۴۰- ۲۰: ۱۹- ۲۶: ۲، ۱۲، ۱۳، ۳۲- مرقس ۹: ۸تا۱۳، ۳۱- ۱۰: ۳۳، ۳۴- ۱۴: ۲۴، ۶۲- ۱۵: ۱۶تا۲۰- لوقا ۹: ۲۲، ۴۴- ۱۲: ۵۰- ۱۳: ۳۲- ۱۷: ۲۵- ۱۸: ۳۱تا۳۴ ۲۲: ۶۳تا۶۶- ۲۳: ۱تا۳۳- ۲۴: ۱۲- یوحنا ۱۰: ۱۵تا۱۸- ۱۶: ۱۶- ۲۰: ۹ وغیرہ)اس کے ساتھ ہی ابنِ اللہ نے اپنے شاگردوں کو یہ بھی بتلادیا کہ اہلِ یہود آپ کی خاطر ان کو بھی طرح طرح کی ایذائیں پہنچائینگے اوران کو قتل کریں گے (متی ۲۴: ۹تا ۱۳- ۵: ۱۰تا۱۱- ۱۰: ۱۶تا۲۳- ۲۳: ۳۴تا۳۶- ۲۴: ۸تا۱۲، مرقس ۱۳: ۹، ۱۲، ۱۳- لوقا ۱۰: ۳- ۱۱: ۴۹- ۱۷: ۳۳- ۲۱: ۱۲، ۱۶، ۱۷- یوحنا ۱۵: ۲۰، ۲۱- ۱۶: ۲تا۴وغیرہ)۔ لیکن جس طرح قرآن اور دورِ حاضرہ کے مسلمان یہ بات گوارہ نہیں کرسکتے کہ خدا کا پیارا نبی مقتول ومصلوب ہو اور کہتے ہیں کہ وما قتلوہ وما صلبوا اسی طرح شاگرد بھی یہ بات گواراہ نہ کرسکے اور اُن میں سے ایک نے کہا ۔" اے خداوند، خدا نہ کرے ۔ یہ تجھ پر ہر گز نہیں ہونے کا"۔ پر ابن اللہ نے اسے سمجھایا کہ صلیب کی راہ درحقیقت حدا کی راہ ہے اور فرمایا کہ " تو خدا کی باتوں کا نہیں بلکہ آدمیوں کی باتوں کا خیال رکھتا ہے"۔ اور علی الاعلان فرمایا " اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سی انکار کرے اوراپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اسے کھوئیگا اور جو کوئی میرے واسطے اپنی جان کھوئیگا وہ اسے پائیگا۔وہ وقت آگیا ہے کہ ابن آدم جلال پائے میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تک گیہوں کا دانہ زمین پر گر کے مر نہیں جاتا وہ اکیلا رہتا ہے لیکن جب مرجاتا ہے تو بہت سا پھل لاتا ہے ۔ ابن آدم کا اونچے پر چڑھایا جانا ضرور ہے اور جب میں اونچے پر چڑھایا جاؤں گا ۔ تو سب کو اپنے پاس کھینچوں گا"۔(متی ۱۶: ۲۱تا۲۷- یوحنا ۱۲: ۲۳و۲۴- ۳۲تا۳۴) آپ نے شاگردوں کو خبردار کرکے فرمایا " لوگ تم کو ایذا دینے کے لئے پکڑوائیں گے اور تم کو قتل کریں گے ۔مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا"(متی ۲۴: ۸تا۱۲)۔

مولوی صاحب کو یہ خیال نہ آیا کہ جو شخص اپنے شاگردوں کو " مرتے دم تک وفادار" رہنے کی تلقین کرتا ہے ( متی ۱۰: ۲۲)وہ خود بھی "آخر تک برداشت" کریگا۔ کلمتہ اللہ نے اپنے حواریوں کو فرمایا تھا کہ ایذا اور مصیبت کے وقت وہ خدا پر بھروسہ رکھیں۔ (متی ۱۰: ۱۹و۲۹- مرقس ۱۳: ۱۱) اور ایذا پہنچانے والوں کے لئے دعائے خیر کریں(متی ۵: ۴۴) آپ نے کیوں نہ سوچا کہ جو شخص اپنی تعلیم پر چل کر صلیب پر سے اپنے دشمنوں کے لئے دعائے مغفرت مانگتا ہے وہ خود اسی صلیب پر ضرور خدا پر بھروسہ رکھیگا؟ وہ جو دوسروں کو کہتا ہے " خاطر جمع رکھو میں دنیا پر غالب آیا ہوں۔ میں اپنا اطمینان تم کو دیتا ہوں"(یوحنا ۱۶: ۳۳) خود قلبی اطمینان سے کس طرح محروم ہوسکتا ہے؟ ناظرین ہی انصاف سے بتلائیں

کہ حضرت ابن اللہ باپ کی رفاقت اور اطمینان پائے بغیر کس طرح ایسے کلمات اپنے منہ سے نکال سکتے ہیں؟ اگر خدا نے مسیح کو ترک کردیا ہوتا تو وہ کس طرح خود مطمئن ہو کر ایسے تسلی بخش کلمے فرماسکتے ہیں؟ ناظرین نے حضرت ایوب کا نام ضرور سنا ہوگا۔ جب اس پر مصائب وآلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تو وہ خدا سے بحث کرتا ہے اورخدا کو موردِ الزام گردان کر اس کواپنا دشمن اوراپنےآپ کو بے گناہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا جانتا ہے کہ میں بے گناہوں تاہم وہ بے انصافی سے مجھ کو ترک کرتا ہے اور خواہ مخواہ مجھ کو مجرم قرار دینے پر تلا ہے۔ ایوب کہتا ہے کہ خدا گویا صُم بکمہ"۔آسمان پر بیٹھا ہے نہ سنتا ہے نہ جواب دیتا ہے اور نہ میری واویلا کی پروا کرتا ہے۔ ناظرین خدارا انصاف سے کہنا کیا آپ کو مسیح مصلوب کا وطیرہ ایوب کا سا نظر آتا ہے؟ کیا صلیب پر ابنِ اللہ کے کسی قول یا فعل سے کسی صاحب ہوش کے دماغ میں یہ خیال بھی آسکتا ہے کہ منجئی عالمین کا ایمان آخری وقت میں ایک لمحہ یا لمحہ کے کسی حصہ کے لئے بھی متزلزل ہو گیا تھا؟

مولانا نے ذرا غور وفکر کرکے یہ خیال تو کیا ہوتا کہ ہر قسم کی اذیت ، مصیبت اور عذاب کو صبر اور محبت کے ساتھ برداشت کرلینے کے بعد جب ان تمام مصائب عقوبت اور عذاب کا خاتمہ ہونے والا تھا تو کیا دام واپسین مسیح مصلوب کا ایمان متزلزل ہوسکتا تھا؟ کیا ایسے وقت یاس اور نااُمیدی ابنِ اللہ پر اس قدر غالب آسکتی تھی کہ وہ خیال کرتے کہ خدا نے ان کو ترک کردیا ہے؟ ان کی تو یہ تعلیم تھی کہ " خدا پر ایمان رکھو" (مرقس ۱۱: ۲۲) اور وہ اپنے اسی ایمان کے باعث مصلوب بھی کئے گئے تھے تو کیا خدا ایسے ایمان دار کو چھوڑ سکتا تھا ؟ کیا خدا کا وطیرہ ہے کہ وہ اپنے ایماندار بندوں کو عین ان کی حاجت کے وقت ترک کردیا کرتا ہے اوروہ بھی ایسے ایمان دار کو جو کروڑوں کے " ایمان کا بانی اور کامل کرنے والا " ہو۔ (عبرانیوں ۱۲: ۲) ایسے ایمان دار کا ایمان کس طرح متزلزل ہوسکتا تھا؟ فرانسیسی عالم ڈاکٹر ایلفرڈ لوازی (جو راسخ الاعتقاد مسیحی نہیں تھا) ان الفاظ کی نسبت کہتا ہے[1] " یہ الفاظ خدا سے دُوری اور نااُمیدی کو ظاہر نہیں کرتے ۔ یہ ایک راستباز شخص کو چیخ وپکار ہے جو درد وکرب میں مبتلا ہے لیکن اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ خدائے قدوس کی محبت اور حفاظت موت میں بھی اس کو چاروں طرف گھیرے ہوئے ہے"۔

ڈاکٹر ونسنٹ ٹیلر کے الفاظ " یہ[2] نظر یہ کہ خدا نے یسوع کو چھوڑدیا تھا۔ اب اس قابل نہیں رہا کہ اس کا ذکر بھی کیا جائے"۔

جرمن عالم ڈیبیلس کہتا ہے کہ اس فقرہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خدا نے مسیح کو چھوڑدیا تھا یا مسیح کو ایسا معلوم دیتا تھا کہ خدا نے اس کوچھوڑدیا ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ کوئی بھی دیندار یہودی مرتے دم اس آیت کو پڑھتے وقت یہ خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا تھا کہ خدا نے اس کو چھوڑدیا[3] ہے۔

ناظرین ۔ للاللہ، ذرا نصاف کریں ۔ کیا خدا کا انصاف اس بات کا متقاضی ہوسکتا تھا کہ وہ ابن اللہ کے ساتھ ایسا سلوک کرے جو وہ انجیل جلیل کے مطابق بد ترین گنہگاروں سے بھی نہیں کرنا چاہتا (یوحنا ۳: ۱۶۔ لوقا ۱۵: ۷)؟ خدا کی محبت کس طرح اس بات کی متقاضی ہوسکتی تھی کہ وہ ایسے تاریک وقت میں اپنی روشنی کو اس سے باز رکھتی؟ منجی عالمین گناہ اور شیطان پر غالب آئے لیکن آپ نے آخری دم ان سے شکست کھا کر فتح حاصل نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس دام واپسین کے وقت بھی خدا کی حضوری اور قربت کے احساس کی وجہ سے آپ شیطان پر موت کی تلخی کے وقت غالب آئے اورآپ نے آسمان کی بادشاہت سارے مومنین کے لئے کھول دی"۔

---

[1] Loisy, Le Evangiles Synoptiques.

[2] Life and Ministry Of Jesus p.143 in Vol .7 of the Interpreter's Bible.

[3] Dibelius. From Tradition to Gospel pp.193 –194

انجیل جلیل سے یہ ثابت ہے کہ ابن اللہ نے مصلوب ہونے سے پیشتر ایک ایک با
کی پیشین گوئی کے طور پر پہلے سے اپنے شاگردوں کو خبردی تھی۔ چنانچہ اس مخبر صادق نے
فرمایا تھا" تم سب اسی رات میری بابت ٹھوکر کھاؤ گے ۔ لیکن میں اپنے جی اٹھنے کے بعد تم
سے پہلے گلیل کو جاؤنگا" اور مقدس پطرس کو مخاطب کرکے فرمایا تھا"۔ اسی رات مرُغ کے
بانگ دینے سے پہلے تو تین بار میرا انکار کرے گا"۔ تم میں سے ایک جو میرے ساتھ کھانا کھاتا
ہے مجھے پکڑوائیگا"۔ دیکھو ہم یروشلیم کو جاتے ہیں اور ابنِ آدم سردار کاہنوں اور فقیہوں کے
حوالے کیا جائیگا اور وہ اس کے قتل کا حکم دینگے اور اسے غیر قوموں کے حوالے کریں گے اور وہ
اسے ٹھٹھوں میں اڑائیں گے اور اس پر تھوکینگے اور اسے کوڑے ماریں گے اور قتل کریں گے
اور تین دن کے بعد وہ جی اٹھیگا"۔ (مرقس ۱۰ باب۔ متی ۲۰ باب وغیرہ) لیکن آپ نے ان
کو یہ خبر کبھی نہ دی کہ خدا باپ بھی مجھے ترک کردیگا۔ انجیل جلیل کے کسی لفظ سے ہم کو یہ پتہ
نہیں مل سکتا کہ خداوند کے نزدیک کبھی یہ خیال بھی پھٹکا ہو کہ خدا آپ کو چھوڑدیگا۔ اس کے
برعکس گتسمنی باغ میں جانکنی کی حالت کا ایک ایک لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو کامل یقین
تھا کہ خدا کی قربت اکمل طور پر اس عذاب کے وقت آپ کا ساتھ دے گی۔

ناظرین آپ کوہ کلوری پر نگاہ کریں اور تینوں مصلوبوں کو دیکھیں۔ کیا آپ کو تینوں
کے تینوں مصلوب خدا کے ردکئے ہوئے نظر آتے ہیں؟ کیا مسیح مصلوب کا وطیرہ وہی ہے جو
باقی دوڈاکوؤں کا ہے؟ یہ ڈاکو تومانتے ہیں کہ وہ " اپنے کاموں کا بدلہ پارہے ہیں اور ان کی سزا
واجبی ہے"(لوقا ۲۳: ۴۱) کیا معترض ابنِ اللہ کی دشمنی میں ان ڈاکوؤں سے بھی زیادہ قسی
القلب ہوگئے ہیں ۔ ان میں سے ایک ڈاکو تائب ہوا تو ابنِ اللہ نے فرمایا" آج ہی تو میرے
ساتھ فردوس میں ہوگا"(لوقا ۲۳: ۴۳) کیا ایک شخص جو خود خدا کی رفاقت سے جدا ہوچکا ہو
دمِ واپسین کسی دوسرے گنہگار کے گناہ معاف کرکے اس کو اسی روز اپنے ساتھ جنت میں
داخل ہونے کی بشارت دے سکتا ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ خدا کی پدرانہ محبت ابن اللہ کی تمام زندگی بھر آپ کا واحد سہارا تھی۔
آپ کو اس لازوال ابدی محبت کا احساس اس قدر تھا کہ دنیا کی کوئی آفت آپ کے جیتے جی اس
کو محو نہ کرسکی بلکہ صلیب پر سے آپ نے آخری لفظ جو اپنی زبانِ صداقت بیان سے فرمائے یہ
تھے" ۔ اے باپ ۔ میں اپنی روح تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں اور یہ کہہ کر دم دے
دیا"۔(لوقا ۲۳: ۴۶) معترض نے کچھ تو غور کیا ہوتا۔ کیا یہ الفاظ مرتے دم کسی ایسے شخص
کے منہ سے نکل سکتے ہیں جس کو یہ خیال ہو کہ خدا نے اس کو چھوڑ دیا ہے؟ اگر خدا نے ابنِ اللہ
کو فی الواقع ترک کردیا تھا اور صلیب پر سے ان کی تمام زندگی کا کام ملیہ میٹ ہوگیا تھا تو وہ اپنے
آخری دم فاتحانہ انداز سے" بڑی آواز سے پکار کے" کیوں اعلان کرتے ہیں کہ خدا کا وہ کام جو
اس نے ابنِ اللہ کے سپرد کیا تھا" پورا ہوا" (یوحنا ۱۹: ۳۰) اور یہ تمام الفاظ کچھ ایسے
انداز سے باآواز بلند فرمائے گئے کہ سخت دلِ رومی صوبہ دار تک متاثر ہوگئے (لوقا ۲۳: ۴۷)
لیکن معترض حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرکے حضرت کلمتہ اللہ کی شان میں سوادبی
کرنے سے ذرا نہیں جھجکتے اور کہتے ہیں کہ " مسیح اس عاجزانہ حالت میں صلیب پر لٹکتے ہوئے
گویا یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کردیا     ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے (صفحہ ۱۰۳)

ہر انجیل خوان حضرت ابنِ اللہ کی زندگی کی آخری ساعتوں کا حال پڑھ کر دیکھ سکتا
ہے کہ " عاجزانہ حالت " اور " ضعف " آنخداوند کے پاس پھٹکے بھی نہ تھے۔ آپ فاتحانہ انداز
میں سردار کاہن کو فرماتے ہیں " اب سے ابن آدم قادر مطلق خدا کی دہنی طرف بیٹھا رہے گا"
(لوقا ۲۲: ۶۹) اور میں اس ستودہ (خدا) کا بیٹا مسیح ہوں اور" تم ابن آدم کو قادر مطلق کی
دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے " (مرقس ۱۴: ۶۲) اور
گورنر پلاطوس کو مخاطب کرکے کہتے ہیں میں حق کا بادشاہ ہوں ۔" میں اس لئے پیدا ہوا اور اس
واسطے دنیا میں آیا ہوں کہ حق پر گواہی دوں۔ جو کوئی حقانی ہے وہ میری آواز سنتا ہے"(یوحنا
۱۸: ۳۷تا ۳۸)۔

ابنِ اللہ فرماتے ہیں کہ آپ کا اس دنیا میں آنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ آپ خدا کی مرضی کو پورا کریں۔ آپ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ باپ کی مرضی کو پورا کرنے میں صرف کیا (یوحنا ۵: ۲۰۔ ۵: ۳۰۔ ۶: ۳۷۔ ۷: ۱۶۔ ۱۲: ۱۰۔ ۱۹: ۳۲ وغیرہ) اپنی زندگی کی آخری شب آپ نے خدا سے التجا کرکے کہا تھا" اے باپ۔ میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو"۔ اب جب وہ خدا کے ارادے اور منشاء اور مرضی کے مطابق فرمانبرداری سے موت بلکہ صلیبی موت کو برداشت کرکے خدا کی مرضی کو پورا کررہے ہیں تو خدا ان سے کس طرح جدا ہوسکتا ہے؟ ان کی دعا کے الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ ابن اللہ کی نظروں کے سامنے صلیب تھی اور مولوی صاحب کے قیاس (صفحہ ۱۹۰) کے خلاف ابنِ اللہ کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ خدا کسی خوارقِ عادت طور پر آپ کو صلیبی موت سے بچائیگا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ صلیب کی راہ عین خدا کی مرضی کے مطابق ہے(متی ۱۶: ۲۱تا ۲۸)۔ پس اگر مولوی صاحب کی تفسیر صحیح ہے تو ہمارا یہ حق ہے کہ ہم ان سے پوچھیں کہ ان باتوں کے پیشِ نظر ہونے کے باوجود ابنِ اللہ نے کیوں ایک ایسا کلمہ زبان سے نکالا جس سے بقول آپ کے یاس وناامیدی ٹپکتی تھی؟ ان کا فرض ہے کہ وہ ہم کو بتلائیں کہ یاس اور ناامیدی کس چیز کی نسبت تھی؟ وہ کیا امید تھی جو برنہ آئی اور جس کے پورا نہ ہونے کے باعث یہ یاس انگیز کلمہ بقول معترض ابن اللہ کے منہ سے نکلا؟ ابن اللہ تو اپنے تجربے سے جانتے تھے کہ آپ دنیا اور شیطان پر غالب آگئے ہیں ( متی ۴: ۱۱۔ یوحنا ۱۶: ۳۳ وغیرہ) دریں حال دم واپسین ناامیدی اور یاس کی کیا وجہ تھی؟ قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ ایک شخص پر جو بقول مولوی صاحب " زاری لاچاری" کی عاجزانہ حالت میں صلیب پر لٹکا" ہو مایوسی اسی قدر غالب ہوگی کہ اس کی یاس اور ناامیدی کی آواز دھیمی نکلے گی۔ لیکن ابنِ اللہ کی بلند و اور " بڑی آواز کی پکار" (لوقا ۲۳: ۴۶۔ متی ۲۷: ۵۰۔ مرقس ۱۵: ۳۷) یہ ثابت کرتی ہے کہ ناامیدی، مایوسی اور یاس صلیب کے نزدیک پھٹکنے بھی نہ پائی تھی۔ بلکہ یہ " بڑی آواز کی پکار" ایک فاتحانہ آواز تھی جو جسم کی کمزوری اور اذیب کے باوجود الہیٰ رفاقت اور قربت کی وجہ سے بلند تھی جس کو سن کر صوبہ دار بھی مرعوب ہوکر مان گیا کہ " بے شک یہ آدمی راست باز تھا"۔(لوقا ۲۳: ۴۷)۔

سطور بالا میں ہم ذکر کرچکے ہیں کہ آخری شب گتسمنی باغ میں ابن اللہ نے اپنے آپ کو خدا کے ہاتھوں میں سپرد کردیا تھا اور کہا تھا" اے باپ۔ میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو"۔ جس سے آپ کا مطلب محض" گردن برضائے الہیٰ کو محض سر تسلیم خم کرنے سے پورا نہیں کرسکتا بلکہ الہیٰ ارادہ اور منشاء کے ساتھ خیال قول اور فعل سے بدل وجان عملی تعاون کرنے سے پورا کرتا ہے۔ (یوحنا ۱۲: ۲۷تا ۲۸) یہی وجہ ہے کہ آپ نے دعا ختم کرنے کے بعد ہی شاگردوں کو ارشاد فرمایا" اٹھو چلیں" (مرقس ۱۴: ۴۲) تاکہ خدا کی مرضی کو پورا کریں اور موت کو خدا کی محبت اور اس کے جلال کا وسیلہ بنائیں (لوقا ۲۴: ۲۶) آپ مُدت سے اس موت کے پیالہ کے منتظر تھے۔ اور جامِ شہادت کو پینے کے خواہشمند تھے( متی ۲۱: ۲۲) آپ نے علے الاعلان فرمایا تھا کہ " مجھے (صلیبی موت کا بپتسمہ لینا ہے۔ اور جب تک وہ نہ ہولے میں بہت ہی تنگ رہوں گا"(لوقا ۱۲: ۵۰) کیونکہ آپ کو یہ علم تھا کہ آپ کی موت بھی آپ کی زندگی کی طرح " بہتوں کے فدیہ" کے لئے ضروری اور لازمی ہے (مرقس ۱۰: ۴۵) آپ نے اپنی موت کی وجہ بتلا کر فرمایا" وہ وقت آگیا کہ ابن آدم جلال پائے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک گیہوں کا دانہ زمین میں گر کر مر نہیں جاتا اکیلا رہتا ہے۔ لیکن جب مرجاتا ہے تو بہت سا پھل لاتا ہے۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اسے کھودیتا ہے اور جو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھیگا۔۔۔۔ پس میں کیا کہوں کہ اے باپ مجھے اس گھڑی سے بچا؟ لیکن میں اسی سبب سے تو اس گھڑی کو پہنچا ہوں۔ اے باپ۔ اپنے نام کو جلال دے۔ پس آسمان سے آواز آئی کہ میں نے اس کو جلال دیا ہے اور پھر بھی دونگا"۔ یوحنا ۱۲: ۲۳تا ۲۸) معترض کو ذرا خیال نہ آیا کہ اس قسم کے شخص کے منہ سے کس طرح دم واپسین کوئی یاس انگیز کلمہ نکل سکتا ہے؟

# انجیل کی قطعی نص

مولوی صاحب۔ آئیے ہم آپ کو ابنِ اللہ کے وہ کلمات طیبات سنائیں جو آپ کے وہم کے خلاف ایک قاطع اور قطعی دلیل ہیں۔ آپ تو بغیر کسی دلیل کے دعوےٰ کرتے ہیں کہ خدا نے ابنِ اللہ کو ترک کردیا تھا لیکن سنئے ابن اللہ کو ترک کردیا تھا لیکن سنئے ابنِ اللہ خود یہود کو کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا" میں اکیلا نہیں بلکہ میں ہوں اور باپ ہے جس نے مجھے بھیجا ہے "۔(یوحنا ۸: ۱۶) پھر بتاکید فرمایا" جس نے مجھے بھیجا ہے ۔ وہ میرے ساتھ ہے۔ اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا "۔ اور ساتھ ہی وجہ بھی بتلادی۔" کیونکہ ہمیں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند ہیں"( یوحنا ۹: ۲۹) پھر آپ نے اپنی زندگی کی آخری شب شاگردوں کو فرمایا۔" تم سب پراگندہ ہو کر اپنے اپنے گھر کی راہ لوگے اور مجھے اکیلا چھوڑ دوگے ۔ تو بھی میں اکیلا نہیں ہوں کیونکہ باپ میرے ساتھ ہے"(یوحنا ۱۶: ۳۲) کیا یہ انجیلی نقص قطعی طور پر آپ کے اعتراض کا منہ بند نہیں کردیتی ؟ باپ کی محبت آپ کو ہر لحظہ چاروں طرف زندگی میں ہر لمحہ موت میں گھیرے رہی۔آپ خدا کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ " اے باپ میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ تونے میری سن لی اور مجھے تو معلوم ہے کہ تو ہمیشہ میری سنتا ہے "(یوحنا ۱۱: ۴۱)اور عبرانیوں کے خط کا مصنف اس پر صادر کرکے کہتا ہے کہ ۔ خدا نے زندگی اور موت دونوں حالتوں میں ابنِ اللہ کی سنی(عبرانیوں ۵: ۷تا۸) اور اس کا رفیق رہا۔

مقدس پولوس رسول بھی فرماتاہے کہ "خدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتاہے۔ کہ جب ہم گنہگارہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موا۔ پس ہم اپنے سیدنا مسیح کے سبب جس کے وسیلے سے اب ہمارا خدا کے ساتھ میل ہوگیا خدا پر فخر کرتے ہیں "(رومیوں ۵: ۸تا ۱۱)۔ اب مولوی صاحب ہی فرمائیں کہ اگر خدا نے عین صلیب کے موقع پر مسیح مصلوب کو چھوڑدیا تھا تو اس نے " اپنی محبت کی خوبی" کا اظہار کس طرح کیا؟ اور ہم کس بات پر اور کس طرح فخر" کرسکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں ڈاکٹر بٹرک کے الفاظ قابل غور ہیں وہ کہتا ہے[1] " ہم جانتے ہیں کہ دیندار یہودی مصیبت کے وقت اس زبور کو پڑھ کر تسلی حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ان الفاظ کی تلاوت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سیدنا مسیح اپنا ایمان کھوبیٹھے تھے اور کہ خدا کی رفاقت آپ کو نصیب نہ تھی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اگرچہ سب آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے لیکن خدا آپ کے ساتھ تھا۔ اور اس سے پہلے آپ کو خدا کی ایسی قربت کبھی حاصل نہ ہوئی تھی جیسی اس لمحہ میں حاصل تھی۔ جب آپ خدا کی کامل فرمانبرداری کرکے اپنی جان قربان کررہے تھے۔ خدا باپ نے اپنے بیٹے کو اس لمحہ میں ایسی قربت عطا کی تھی کہ وہ مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کررہا تھا(۲ کرنتھیوں ۵: ۱۳)۔

مقدس پولوس کو مسیح مصلوب کے ایثار، موت اور قربانی میں خدا کا مقصد نظر آتا ہے چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ " خدا نے مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کرلیا"(۲ کرنتھیوں ۵: ۸) دیکھئے الفاظ " خدا نے مسیح میں ہو کر " کیسے صاف واضح اور غیر مبہم ہیں۔ خدا نے مسیح سے جدا ہو کر اور اس کو ترک کرکے نہیں بلکہ " مسیح میں ہو کر اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کرلیا"۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ صلیبی موت کے وقت باپ ابنِ اللہ کے ذریعے اور اس میں ہو کر نجات کا کام کرتا ہے۔ کیونکہ بیٹا باپ کا مظہر ہے(افسیوں ۲: ۴تا ۵۔ گلتیوں ۴: ۳تا ۶ وغیرہ)۔

حق تو یہ ہے کہ خدا اپنے بیٹے سے صلیب کے موقع پر خاص طور پر" خوش " تھا۔ کیونکہ خدا کی محبت کا نظارہ ہم کو اعلیٰ ترین جلالی صورت میں صلیب پر ہی ملتا ہے ۔ خدا محبت اور سیدنا مسیح کی زندگی اور موت اس محبت کے جلال کا کامل اور اکمل ظہور ہیں۔ ابنِ اللہ مجسم محبت تھے۔ آپ نے اپنی محبت کا اظہارِ خلق کی خدمت ، ایثارِ نفس اور کامل قربانی کے ذریعہ

---

[1] George A.Buttrick

Exegesis and Exposition of St. Matthew in vol 7 of the Interpreter's Bible pp.608 –609

کیا (متی ۲۰: ۲۸۔ مرقس ۱۰: ۴۵۔ ۱۰: ۱۷ تا ۱۸۔ ۱۳: ۱ تا ۷۔ ۳: ۱۳۔ ۲۱ ۴: ۳۴۔ ۵: ۱۷، ۴۴۔ ۸ باب ۱۷: ۱۔ وغیرہ)۔ جس طرح ابنِ اللہ کی زندگی ایثار کے ذریعہ خدا کی محبت کا ظہور تھی جس کے وسیلے سب پر عیاں ہوگیا تھا کہ " خدا اس کے ساتھ ہے"(اعمال ۱۰: ۳۸) اسی طرح آپ کی موت ایثار و محبت کا ثبوت تھی اور موت کے وقت بھی خدا آپ کے ساتھ تھا کیونکہ آپ محبوبِ کبریا تھے۔(متی ۳: ۱۷۔ ۱۷: ۵) چنانچہ آپ نے فرمایا کہ " باپ مجھ سے اس لئے محبت رکھتا ہے کہ میں اپنی جان دیتا ہوں۔ کوئی اسے مجھ سے چھینتا نہیں بلکہ میں اسے آپ ہی دیتا ہوں "(یوحنا ۱: ۱۷ تا ۱۸) آپ کی مبارک موت آپ کی زندگی کا کمال اور تاج تھی۔ جب خدا نے آپ کی زندگی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑا تو وہ آپ کی موت میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ بالخصوص جب یہ مبارک موت آپ کی زندگی کا کمال تھی؟ آپ نے زندگی اور موت دونوں میں اپنی جان دوسروں کے لئے نثار کردی( ۱۔ یوحنا ۳: ۱۶۔ متی ۲۰: ۲۸) جس طرح بنی اسرائیل کو کوہِ سینا پر پرانے عہد نامہ کا جلوہ نظر آیا اسی طرح کوہِ کلوری پر الہیٰ محبت کے کمال کے لئے عہد کا جلوہ نظر آتا ہے۔ صلیب پر کا تجربہ ابنِ اللہ کے ایمان اور کاملیت کا ظہور ہے۔(فلپیوں ۲: ۸ تا ۱۱) عبرانیوں کے خط کا مصنف ہم کو بتلاتا ہے کہ ابنِ اللہ کی نظروں کے سامنے نا امیدی اور یاس نہیں بلکہ ایک عجیب خوشی تھی اور کہتا ہے کہ " ہمارے ایمان کے بانی اور کامل کرنے والے یسوع نے اس خوشی کے لئے جو اس کی نظروں کے سامنے تھے شرمندگی کی پرواہ نہ کرکے صلیب کا دکھ سہا اور خدا کے تخت کی دہنی طرف جا بیٹھا (عبرانیوں ۱۲: ۲) ابن اللہ کی نگاہ اس "خوشی " پر ٹکی ہوئی تھی (زبور ۱۱۹: ۳۵) جس کی وجہ سے آپ نے صلیب کی انتہائی " شرمندگی " کی پرواہ نہ کی۔ یہ " خوشی " کیا تھی ؟ ابن اللہ اپنی ظفریاب قیامت کے بعد اپنی زبانِ معجز بیان سے اپنے شاگردوں کو اور مرحوم کے ہم خیالوں کو اس خوشی کی نسبت بتلاتے ہیں ۔" اے نادانو اور نبیوں کی ساری باتوں کے ماننے میں سست اعتقادو، کیا مسیح کو یہ دکھ اٹھا کر اپنے جلال میں داخل ہونا ضرور نہ تھا؟(لوقا ۲۴: ۲۵) آپ کامل اور مجسم محبت تھے اور محبت ایثار کا دوسرا نام ہے۔ ایثار تب ہی کامل ہوتا ہے جب اس میں خوشی ہو اور یہ خوشی ایثار کا جلال ہوتی ہے۔ کسی ماں سے پوچھو کہ وہ اپنے بیمار بچہ کو کسی دایہ یا نرس کے سپرد کرنے کے بجائے اس کی خدمت میں قربانی اور ایثار نفس سے کام لے کر رات دن ایک کیوں کردیتی ہے؟ ماں کی مامتا کی خوشی ایسے ایثار اور قربانی میں ہی پوری ہوتی ہے اور یہ خوشی ماں کی محبت ایثار کا جلال ہے۔ چنانچہ ابنِ اللہ نے بھی آخری شب اپنے شاگردوں کو فرمایا" میں نے یہ باتیں اس لئے تم سے کہی ہیں کہ میری خوشی تم میں ہو اور تمہاری خوشی پوری ہوجائے۔ اس سے زیادہ محبت کوئی شخص نہیں کرسکتا کہ اپنی جان اپنے دوستوں کے لئے دے دے "(یوحنا ۱۵: ۱۳۔ یسعیاہ ۵۳: ۱۱) ابنِ اللہ نے جو دعا آخری شب کی تھی اس میں آپ نے خدا کو مخاطب کرکے کہا " اے باپ ۔ وہ گھڑی آپہنچی اپنے بیٹے کا جلال ظاہر کرتا کہ بیٹا تیرا جلال ظاہر کرے۔ جو کام تو نے مجھے کرنے کو دیا تھا اس کو پورا کرکے میں نے زمین پر تیرا جلال ظاہر کیا اور اب اے باپ تو اس جلال سے جو میں دنیا کے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا مجھے اپنے ساتھ جلالی بنالے"(یوحنا ۱۷: ۱۵)۔

## مولوی صاحب کی تفسیر قرآن کے مخالف

پس انجیل جلیل کے مطالعہ سے ثابت ہوجاتا ہے کہ مرحوم مولوی صاحب کی تفسیر غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شہادت ، کلمتہ اللہ کی شہادت ۔ حوارئین کی گواہی، ابن اللہ کی زندگی کے آخری ہفتہ کے واقعات ۔ آپ کی صلیب اور اذیت کا ایک ایک لمحہ اور انجیل جلیل کی ایک ایک آیت ان کی تفسیر کا غلط ثابت کرتی ہے۔ اگر معترض ان سے قائل نہیں ہوئے تو کم از کم قرآن وحدیث کے تو آپ قائل ہیں۔ اور یہ دونوں عصمتِ مسیح پر شاہد ہیں (سورہ عمران آیت ۱۳۰ وغیرہ مشارق الانوار صفحہ ۹۲۹)۔ جس حال کہ کلمتہ اللہ بے گناہ اور معصوم تھے تو خدا آپ کو کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ کیا خدا بے گناہ ایمان دار بندوں اور اپنے معصوم رسولوں کو جانکنی کی حالت میں ترک کردیا کرتا ہے۔ بالخصوص جب وہ اپنے پیغام کی وجہ سے مصائب

وآلام میں مبتلاہوں؟ معترض نے بائیسویں زبور کی آیت کی تاویل کرتے وقت قرآن وحدیث کا ہی پاس اور لحاظ کیاہوتا۔ کیا اسلامی عقائد کے مطابق خدا ان رسولوں کو جو رضائے الہیٰ کو پورا کرتے ہیں ان کی موت کے وقت مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں چھوڑ کر ان کو ترک کردیا کرتاہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق مسیح کی شان ایسی ہے کہ موت کے وقت خدا آپ کو مایوسی کی حالت چھوڑ دیتا؟ وہ جو خدا کا معصوم نبی اور کلمہ ہے اور روح اللہ ہے اور خدا کا رسول اور فرمانبردار بندہ ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ نے احسان کئے کیا اس کا انجام ایسا حسرتناک ہوسکتا ہے؟ قرآن صاف طور پر کہتا ہے کہ المسیح عیسیٰ ابن مریمہ وجیہاً فی الدنیا والاخرۃ ومن المقربین " کہ عیسیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں رودار اور خدا کے مقربوں میں سے ہے"۔ کیا" من المقربین" کی یہی تفسیر ہے کہ موت کے وقت اس کو خدا کی قربت اور رفاقت بھی نصیب نہ ہو؟

اگر معترض آنجہانی مرزائے قادیانی کی پیروی کرکے یہ کہیں کہ ہم حضرت عیسیٰ کی نسبت یہ نہیں مانتے لیکن عیسائیوں کی انجیل یسوع مسیح کی نسبت یہ کہتی ہے تو وہ گویا دنیا پر روشن کردیتے ہیں کہ وہ ایک ایسی بات پیش کرتے ہیں جس کو وہ نہ تو خود مانتے ہیں اور نہ ان کے مخاطب مانتے ہیں اور یہ ایک ایسی شرمناک پوزیشن ہے جس کو کوئی حق پسند جائز نہیں رکھ سکتا۔

مرحوم مولوی صاحب پر واجب تھا کہ اگر وہ کلمتہ اللہ کے متعلق قرآن کی شہادت سے کوئی ایسی بات مانتے ہیں جس کا ذکر انجیل میں ان کے زعم میں اس کے خلاف ہے اور اگر انجیل جلیل کے کسی قول سے کوئی وسوسہ ان کے دل میں پیدا ہوا تھا تو ان کو اس کی تاویل اس طور سے کرنا چاہیے تھی جو اس کو قرآن کے مطابق کردے۔ کیونکہ قرآن کے مطابق انجیل کلامِ الہیٰ ہے جس کا وہ خود محافظ اور مصدق ہے(سورہ مائدہ ع ۶ ۔آیات ۴۸تا ۵۲ و ۹۱ وغیرہ) جس کے مفہوم کو اہلِ عرب پر ظاہر کرنے کی خاطر وہ عربی زبان میں نازل کیا گیا(شعراآیت ۱۹۷ ۔ انعام ع ۲۰ آیات ۱۵۶ تا ۱۵۸ وغیرہ)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے مطابق سچا مسلمان صرف وہی ہوسکتا ہے جو انجیل پر بھی ایمان رکھے(سورہ بقرہ آیت ۳وغیرہ) اور چونکہ خدا کے کلام میں تضاد وتناقض نہیں ہوتا (سورہ نساء آیت ۸۴) لہذا قرآن وانجیل کی تاویل کا اصول بھی ایک ہی ہے(سورہ یونس آیت ۹۴) ۔ یہ قرآنی اصول صحیح اُصول تفسیر ہے جس کی مفصل تشریح ہم اپنے رسالہ توضیح البیان فی اصول القرآن میں کرچکے ہیں ۔ لیکن مولوی صاحب نے صحیح تاویل کرنے کی بجائے ایسی تاویل کی جو نہ صرف قرآن کے خلاف ہے بلکہ انجیل جلیل کے ایک ایک لفظ کے خلاف ہے اور قرآن وانجیل دونوں اس کو متفقہ طور پر باطل اور مردود قرار دیتے ہیں۔

گر تو قرآں بریں غلط خوانی | ببری رونقِ مسلمانی

اگر معترضین کے ایمان نے ان کو غلط تاویل کرنا ہی سکھلایا ہے تو قرآن ان کو مخاطب کرکے کہتا ہے قل بئسما یامرکمہ بہ ایمانکمہ وان کنتمہ مومنین توکہہ اگر تمہارا ایمان یہی ہے اور تم ہی ایمان دار ہو تو تمہارا ایمان تم کو بُرا سکھاتا ہے۔

اس باب میں ہم نے یہ ثابت کیاہے:

(۱۔) مولوی ثناء اللہ صاحب نے دیدہ ودانستہ واقعات صحیحہ کا اخفا " کرکے عامتہ الناس کو یہ مغالطہ دینا چاہاہے کہ آیہ زیر بحث ابن اللہ کا اپنا" مقولہ "ہے۔ حالانکہ یہ کلمہ آنخداوند کا اپنا "مقولہ " نہیں ہے۔ بلکہ بائیسویں زبور کی پہلی آیت ہے جس کی منجئی کونین نے صلیب پر سے تلاوت فرمائی ۔ اس بحث کے دوران میں مولوی صاحب نے حضرت کلمتہ اللہ کی شان میں اس قدر سوادبی کا ارتکاب کیاہے کہ الامان ۔

بک رہاہوں جنوں میں کیا کچھ | کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

(۲۔)ہم نے انجیل جلیل سے ثابت کیاہے کہ مولوی ثناء اللہ کا استدلال کہ یہ کلمہ ظاہر کرتا ہے کہ خدا میں اور مسیح میں جدائی اور دوری تھی اور کہ خدا نے آپ کو معاذ اللہ چھوڑدیا تھا صریحاً غلط ہے۔ یہ تاویل تفسیر بالرائے کی عمدہ مثال ہے جس کے خلاف مرحوم خود جہاد کرتے رہے۔ یہ تفسیر حضرت کلمتہ اللہ کے کلمات، طیبات، خیالات ، جذبات اور افعال کی ضد ہے اور انجیل جلیل کی آیات بینات کی عین نقیض ہے۔ مولوی صاحب نے آیہ زیر

بحث کو اس طرح ماؤل کردیا ہے اور آپ کی تاویل ایسے درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ اس تاویل " کا لفظ " بھی صادق نہیں آسکتا ۔مولوی صاحب کی تاویل القول بما لایرضیٰ بہ قایلہ کے غلط اصل کے مطابق ہے۔ لہذا مردود ہے۔

# باب سوم

## آیہ زیرِ بحث کا مفہوم

## فصل اوّل ۔ بائیسواں زبور

### بائیسویں زبور کی شانِ نزول

زبور کی کتاب ایک مجموعہ ہے جو قوم یہود کے بہترین شعراء کے ملی اور مذہبی کلام کا انتخاب ہے۔ یہ یہودی شاعر حضرت داؤد سے لے کر مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے اپنے اپنے وقت کے کوائف وحالات کو پیش نظر رکھ کر ان مزامیر کو منظوم کیا۔ بعض مزامیر قوم یہود کی خوشحالی کےزمانہ میں لکھے گئے اور بعض اس قوم کے زوال کے زمانہ میں منظوم کئے گئے ۔ بائیسواں زبور اور چند دیگر مزامیر (مثلاً: ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۱، ۳۵، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۶۹، ۷۱ وغیرہ) کی طرح قوم اسرائیل کی پستی، ذلت ، مصیبت اور زوال کے زمانہ میں لکھا گیا۔ اس زبور کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ مزمور نویس کے ارد گرد کے حالات اس قدر تاریک ہیں کہ قوم یہود پڑی سسک رہی ہے۔ دم توڑ رہی ہے اور فنا ہونے کے قریب ہے۔ بُت پرست اقوام نے خدا کی اپنی قوم کو جو اقوام عالم کے لئے ایک نور تھی (یسعیاہ ۴۲: ۷) چاروں طرف نرغہ میں گھیر رکھا ہے (آیت ۶، ۱۲، ۲۱) مزمور نویس کے دل میں بیم ورجا کی کشمکش ہے۔ اور اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی برگزیدہ قوم کو ترک کردیا ہے (آیت ۱) " صیون کہتی ہے یہواہ نے مجھے ترک کیا ہے اور خداوند مجھے بھول گیا ہے " یسعیاہ ۴۹: ۱۴ ، زبور ۱۳: ۱ - ۸۸: ۱۴) بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ۲۲ واں زبور حضرت نحمیاہ کے زمانے کے حالات کا آئینہ ہے ۔ جب قوم اسرائیل " نہایت مصیبت اور ذلت " کی حالت میں گرفتار تھی (نحمیاہ ۱: ۳) وہ اس زبور کی ساتویں آیت کی نحمیاہ ۴: ۲ کے ذریعہ اور چھٹی آیت کی نحمیاہ ۲: ۱۹ کے ذریعہ تعبیر کرتے ہیں ۔ ان مفسرین کا خیال ہے کہ آیت ۱۲ سے مراد عمونی ہیں۔ (صفنیاہ ۲: ۸۔ یرمیاہ ۴۹: ۱) اور تیرھویں آیت سے مراد قبائل عرب ہیں اور آیت ۱۶ و ۱۷ سے مراد سکم کے رہنے والے ہیں۔

### اس زبور کا مطلب

بائیسویں زبور کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مصنف شاعر (جو خود ایک ایمان دار شخص ہے) ناموافق حالات کی تاریکی میں اپنے ایمان کے ذریعہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایک قوم جو اقوامِ عالم میں سے خدا کی واحد پرستار ہے کیوں فنا ہورہی ہے ؟ پہلی آیت میں لفظ" کیوں" خدا کی پروردگاری پر شک نہیں کرتا بلکہ اس سے مراد تعجب کا سوال اور حیرانگی کا اظہار ہے ۔ وہ پوچھتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ خدا کی برگزیدہ قوم فنا ہورہی ہے ؟ مزمور نویس متعجب ہو کر سوال کرتا ہے کہ خدا نے قوم اسرائیل کو کیوں تر کردیا ہے ؟ اوراس قوم کی پکار اس کے نجات دینے والے خدا سے کیوں دور ہے؟ وہ کیوں نہیں سنتا ؟ قوم کی حالت ایسی ہے کہ وہ شب وروز بے قراری کی حالت میں پڑی کراہتی ہے (آیت ۱، ۲) خدا تو قوم اسرائیل کا قدوس خدا ہے جو زمانہ ماضی میں اس کے دشمنوں کے ہاتھوں سے رہائی دیتا رہا ہے (آیت ۴) اور جس کا وعدہ ہے کہ وہ ایام مستقبل میں بھی اپنی قوم کو چھڑائیگا۔ (استثنا ۳۰: ۳تا ۴ وغیرہ) قوم اسرائیل کی زبونی کا اَب یہ حال ہوگیا ہے کہ وہ ایک کیڑے کی مانند ہوگئ ہے (آیت ۶ یسعیاہ ۴۱: ۱۴) جس کو بُت پرست اقوام حقیر جان کر انگشت نمائی کرتی

ہیں(آیت ۶، ۷۔ یسعیاہ ۴۹: ۷۔ ۵۳: ۱۳) یہ بُت پرست اقوام ازروئے تمسخر اسرائیل کا ٹھٹھا کرکے کہتی ہیں کہ اس قوم نے خدا پر توکل کیا تھا۔ اب اس کو چھڑانے والا خدا آئے۔ اور اپنی برگزیدہ قوم کو ہمارے ہاتھوں سے چھڑالے (آیت ۸۔ یسعیاہ ۴۱: ۱۴۔ ۴۳: ۱۴۔ ۴۴: ۶، ۲۴۔ ۴۷: ۴۔ ۴۸: ۷، ۴۹: ۷، ۲۶۔ ۵۴: ۵، ۸)قوم پر ہلاکت آپڑی ہے (آیت ۱۱) اور بُت پرست اقوام جنگی درندوں، کُتوں اور سانڈوں کی طرح اُس پر پے درپے حملے کررہی ہیں(آیت ۱۲ تا ۱۹)۔ قوم کی زندگی معرض خطر میں ہے اوراس کے دشمن شادیانے بجارہے ہیں۔ ایسے نازک ایام میں اسرائیل کی قوم اپنے خدا سے فریاد کرکے کہتی ہے کہ اے خدا اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کو بُت پرست اقوام کے ہلاکت آفرین ہاتھوں سے بچا( آیت ۱۹، ۲۰) پھر مزمور نویس شاعر کہتا ہے کہ بلاآخر خدا نے اس تنگی کی حالت میں قوم اسرائیل کی گریہ وزاری کی آواز اور دعاسن کراس کو رہائی بخشی (آیت ۲۱، ۲۴) پس قوم اس نجات کو کبھی فراموش نہ کرے گی۔ بلکہ خدا کی ثناخواں ہوکر اس کی ستائش اور مدح سرائی کریگی (آیت ۲۲ تا ۲۶) اور شکر گزار ہوکر بُت پرست اقوام کو خدا کے علم اوراس کی نجات کی بشارت دے گی۔ تاکہ کل اقوام عالم یہ جان لیں کہ سلطنت خداوند کی ہے اوروہی اقوام عالم کا واحد خدا ہے(آیت ۲۷ تا آخر)۔

پس یہ زبور ایک قوم کی چیخ وپکار کی آواز ہے جو وہ اپنی ملی زندگی اور قومی ہستی کی معرضِ خطر میں پڑا دیکھ کر خدا کے حضور کرتی ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ ایسے آڑے وقت میں بھی جب قوم ہلاک اور فنا ہوتی نظر آتی ہے مزمور نویس کا ایمان متزلزل نہیں ہوتا۔ اور گو حالات بظاہر ایسے یاس انگیز ہیں کہ نومیدی کی تاریک گھٹائیں ہر طرف سے اس قوم کو گھیرے ہوئے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس قوم کو چھوڑ دیا ہے۔ تاہم مزمور نویس کے ایمان کا نور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی چمکتا ہے جس کی ضیا پاشیوں سے یاس کی پکار نجات اوررہائی کے نعروں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

سطور بالامیں حوالہ جات دیئیے گئے ہیں ان میں ناظرین نے ملاحظہ کیا ہوگا۔ کہ ۲۲واں زبور اور حضرت یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے دوسرے حصے (ابواب ۴۰ تا آخر) میں مشابہت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔ " خادمِ یہوواہ" ایک " کیڑا" ہے (۴۱: ۱۴) اور قوم اسرائیل ایک ایسی جماعت ہے۔ جس کو لوگ حقیر سمجھ کر (۴۹: ۷۔ ۵۳: ۳) اس سے کنارہ کش ہوتے ہیں گویا کہ وہ جنس انسانی میں شمار ہونے کے قابل ہی نہیں۔( ۵۲: ۱۴۔ ۵۳: ۲، ۱۳۔ ۵۱: ۷) لیکن اس کی امید گاہ اس کا رہائی دینے والا خدا اسرائیل کا قدوس اور واحد خدا ہے جس کی وہ واحد پرستار ہے (یسعیاہ ۴۱: ۱۴۔ ۴۳: ۱۴۔ ۴۴: ۶، ۱۴۔ ۴۷: ۴۔ ۴۸: ۱۷۔ ۴۹: ۷، ۲۶۔ ۵۴: ۵، ۸) اس مختصر مقابلہ سے ظاہر ہے کہ ۲۲ویں زبور کا تعلق صحیفہ مذکور کے اس حصہ سے (جس میں " خادم یہوداہ" کا بارہا ذکر آتا ہے) کس قدر گہرا ہے۔

## صیغہ واحد کا استعمال

مذکورہ بالا تفسیر سے ظاہر ہے کہ بائیسویں زبور میں صیغہ واحد متکلم اور واحد غائب قوم بنی اسرائیل کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور تمام زبور میں اس صیغہ کا اطلاق کسی خاص فرد پر نہیں ہے۔ جو حضرات اہل یہود کی کُتب سماوی کی زبان اور محاورات سے ناواقف ہیں وہ مظالعہ میں پڑ کر خیال کرتے ہیں کہ صیغہ واحد کسی خاص فرد کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن انبیائے عہدِ عتیق کی صحفِ مقدسہ کا مطالعہ ظاہر کردیتا ہے کہ واحد کا صیغہ نہ صرف افراد کے لئے استعمال ہوا ہے بلکہ قوموں، گروہوں اور جماعتوں کے لئے بھی عام طور پر کثیر التعداد مقامات میں مستعمل ہوا ہے۔

تورات شریف اورصحائف انبیاء کے بے شمار مقامات میں قوم بنی اسرائیل کے لئے صیغہ واحد حاضر وارد ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مشتے نمونہ ازخروارے ملاحظہ ہو خروج ۴: ۲۲، استثنا ۶: ۴۔ ۹: ۱۔ ۲۳: ۲۹۔ یسعیاہ ۴: ۲۷۔ ۴۱: ۸۔ ۴۳: ۱ تا ۷۔

۴۳: ۲۲-۴۴: ۱۲تا ۲۲- یرمیاہ ۲: ۲-۴۶: ۲۷- حزقی ایل ۱۳: ۴- ہوسیع ۴: ۱۵-۹: ۱- عاموس ۴: ۱۲-۶: ۶-۷: ۱۵تا ۱۷: صفنیاہ ۳: ۱۴تا ۱۵- وغیرہ وغیرہ) زبور کی کتاب میں (۸۰) مزامیر یعنی آدھے سے زیادہ مزامیر ایسے ہیں جن میں مزمور نویس شعراء واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ ان زبوروں میں بے شمار مقامات میں ایسے مصرعے اور اشعار ہیں جن میں مزمور نویس شعراء واحد حاضر اور واحد متکلم کے صیغے قوم بنی اسرائیل کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ زبور ۱۲۹ اس کی ایک بین مثال ہے۔ کتاب یرمیاہ کا نوحہ میں قوم اسرائیل صیغہ واحد متکلم میں کلام کرتی ہے۔

کُتب عہد عتیق میں واحد کا صیغہ نہ صرف قوم بنی اسرائیل کے لئے وارد ہوا ہے بلکہ دیگر اقوام کے لئے بھی آیا ہے۔ (یشوع ۹: ۷، گنتی ۲: ۱۲تا ۲۱-۲۱: ۲۲- استثنا ۲: ۲۷تا ۲۹- قضاۃ ۱۱: ۱۹ وغیرہ) بعض اوقات کسی شہر کی آبادی کا ذکر من حیث القوم صیغہ واحد میں آیا ہے۔(۱-سیموئیل ۵: ۱۰)۔ بعض مقامات میں صیغہ واحد بنی اسرائیل کے خاص قبائل کے لئے استعمال ہوا ہے۔(یشوع ۱۷ باب آیات ۱۴ تاآخر۔ قضاۃ ۱: ۳- زکریا ۸: ۲۱ وغیرہ) یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے دوسرے حصے میں بالخصوص جہاں "خادم یہوواہ" کا ذکر آتا ہے کہ اور صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے ان مقامات میں صیغہ واحد کسی فرد واحد کے لئے وارد نہیں ہوا بلکہ اس سے قوم بنی اسرائیل کی برگزیدہ جماعت مراد ہے۔ مثلاً ۴۲: ۱تا ۴- ۴۹: ۱تا ۶- ۵۰: ۴تا ۹- ۵۲: ۱۳- ۵۳: ۱۳- میں صیغہ واحد سے مراد قوم اسرائیل کی خاص جماعت ہے۔ چنانچہ اسی صیغہ کے ۴۹ باب کی پہلی چھ آیات میں واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے کہ صیغہ واحد سے مردا کوئی خاص فرد نہیں۔ بلکہ اسرائیل کی برگزیدہ جماعت مراد ہے۔ امثال کی کتاب کے آٹھویں باب میں شاعر نے حکمت اور خرد اور دانش کو شخصِ واحد قرار دیا ہے۔

پس تورات، زبور اور صحائف انبیاء کی زبان اور محاورات سے ظاہر ہے کہ ۲۲ویں زبور میں واحد کا صیغہ قوم اسرائیل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مستند یہودی مفسرین بائیسویں زبور کی اسی طرح تفسیر کرکے کہتے ہیں کہ اس زبور میں صیغہ متکلم سے مُراد قوم بنی اسرائیل ہے جو مصائب وآلام میں مبتلا ہو کر خدا کو پکارتی ہے اور اس کا رہائی دینے والا خدا اس کی گریہ وزاری کو سن کر اس کی مدد کرتا ہے اور قوم کی پستی اور زبونی سے نجات بخشتا ہے۔

## ایلی۔ ایلی۔ لما شبقتنی کا مفہوم

پس اس مزمور شریف کی پہلی آیت ۔" اے میرے خدا! اے میرے خدا! تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا" سے مراد یہ ہے۔" اے قوم اسرائیل کے خدا، اے قوم اسرائیل کے خدا تونے بنی اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا؟ تو اپنی برگزیدہ قوم کی فریاد کی آواز سے اور اس کی آہ فغاں سے کیوں دور رہا؟" ۔

ناظرین نے مرحوم علامہ اقبال کا شکوہ ضرور پڑھا ہوگا۔ آپ بس یہ سمجھ لیجئے کہ آیہ زیر بحث میں بنی اسرائیل کا شاعر قوم بنی اسرائیل کی طرف سے بعینہ اسی طرح شکوہ کرتا ہے جس طرح علامہ مرحوم نے مسلمانان عالم کی طرف سے بارگاہِ خداوندی میں شکوہ کیا تھا۔ یہ مزمور نویس شاعر دیکھتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ملی زندگی معرض خطر میں ہے اور وہ سوال کرتا ہے کہ ایک قوم جو خدائے واحد کی پرستار ہے کیوں فنا ہو رہی ہے؟ واجب تو یہ تھا کہ بُت پرست اقوام پست اور زبون حال ہوتیں۔ زوال اور پستی ایک ایسی قوم کی جزا نہیں ہونی چاہیے جو کل اقوام عالم میں سے خدا کی واحد پرستش کرنے والی ہے۔ ہم مرحوم ڈاکٹر اقبال کی نظم "شکوہ" کے بعض اشعار نقل کرتے ہیں اور ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کا ۲۲ویں زبور کے یہودی "شکوہ" کے اشعار کے ساتھ مقابلہ کریں اور دیکھیں کہ دونوں میں کس قدر موافقت ومناسبت ہے:۔

جرات آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

اے خدا شکوہ ارباب وفا بھی سن لے
خو گر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی؟
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر — کہیں مسجود تھے پتھر، کہیں معبود شجر

خوگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر — مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر ؟

تجھ کو معلوم ہے لیتا نہ تھا کوئی نام تیرا — قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے — زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایت نہیں — بات کیا ہے پہلی اسی مدارات نہیں ؟

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں — اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں ؟

طعنِ اغیار ہے۔ رسوائی و ناداری ہے — کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے ؟

جوئے خوں مے چکد از حسرت دیرینہ ما — مے تپد نالہ بہ نشتر کدہ سینہ ما

مندرجہ بالا اشعار میں سے پہلے تین کا مقابلہ ۲۲ویں زبور کی پہلی دو آیات سے کریں اور ملاحظہ فرمائیں کہ اشعار نمبر ۴، ۵ کی روشنی میں تیسری آیت کا مطلب کس طرح واضح ہوجاتا ہے۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ علامہ مرحوم نے شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن مزمور نویس ایک سچی اور واضح حقیقت کو بیان کرتا ہے کیونکہ یہ امر ایک تاریخی واقعہ ہے اس کے زمانہ میں صرف قوم بنی اسرائیل ہی دنیا بھر میں ایک ایسی قوم تھی جو خدا کی واحد پرستار تھی اور دنیا کی باقی کل امم بُت پرستی میں مبتلا تھیں۔ شعر نمبر ٦ آیات نمبر ۴، ۵، ٦ کو واضح کرتا ہے اور شعر نمبر ۷، ۸ کی مدد سے ہم آیات ٦ تا ۱۳ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور آخری شعر آیات ۱۴، ۱۵ کا سماں ہماری آنکھوں کے سامنے باندھ دیتا ہے۔

پس ۲۲واں زبور ایک " شکوہ" اور شکایت ہے جو کسی زبردست ایمان دار یہودی شاعر نے لکھا ہے۔ اس شاعر کے دل میں قوم کا درد ہے۔ اس کے سینہ میں ملی غیرت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ یہ شکوہ اسی قسم کا ہے جس قسم کا حضرت یسعیاہ نبی نے کیا تھا (باب ٦۳ آیات ۱۵ تا آخر باب ٦۴)۔ جس کا جواب بھی خدا نے اس نبی کو دے دیا تھا (یسعیاہ ۴۹: ۱۳ تا ۱۵) اسی قسم کا شکوہ حضرت یرمیاہ نے کیا تھا"۔اے خداوند میں تیرے ساتھ حجت کروں گا۔ شریر اپنی روش میں کیوں کامیاب ہوتے ہیں؟ انہوں نے جڑ پکڑلی وہ بڑھ گئے بلکہ برومند ہوئے۔ اے اسرائیل کی اُمید اور مصیبت کے وقت میں اس کے بچانے والے ! تو ملک میں پردیسی کی مانند بنا اور اس مسافر کی طرح جو رات کاٹنے کے لئے ڈیرہ ڈالے۔ اے خداوند تو ہمارے درمیان ہے تو ہم کو ترک نہ کر"۔(باب ۱۲، ۱۴) یہ " شکوہ" اسی قسم کا ہے جس قسم کا حضرت حبقوق نے کیا۔" اے خداوند میں کب تک نالہ کروں گا اور تو نہ سنے گا ؟ میں تیرے حضور کب تک چلاؤں گا۔ ظلم ! ظلم اور تو نہ بچائیگا؟ ---- تیری آنکھیں تو ایسی پاک ہیں کہ تو بدی کو نہیں دیکھ سکتا۔ پھر تو دغا بازوں پر کیوں نظر کرتا ہے اور جب شریر صادق کو نگل جاتا ہے تب تو کیوں خاموش رہتا ہے ؟(پہلا باب ) یہ اسی قسم کا"شکوہ" ہے جس قسم کا محمد عربی نے کیا تھا۔ قرآن ایسے ہی انبیاء اللہ کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ (سورہ یوسف ع ۱۲) "پہلے لوگ بھی پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے) یہاں تک کہ جب رسول نا امید ہوگئے اور ان کو یہ گمان ہوا کہ ان کے ساتھ خدا نے جھوٹے وعدے کئے ہیں تو ان کے پاس ہماری مدد آپہنچی ---- اس میں شک نہیں کہ ان قصوں میں عقلمندوں کے لئے عبرت ہے۔ یہ کچھ بناوٹی بات نہیں ہے لیکن اس کلام ( کتبِ آسمانی) کی تصدیق کرتی ہے جو اس کے پہلے ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو ایمان والے ہیں ہر چیز کی، تفصیل، ہدایت اور رحمت ہے"(آیات ۱۱۰، ۱۱۱)۔ اُمید ہے کہ اب معترض اس نکتہ کو ان آیات کی مدد سے سمجھ سکیگا۔ قرآنی سورت سورہ نوح حضرت نوح کے شکوہ سے بھری ہے جو وہ درگاہِ الہٰی میں کرتا ہے۔

بائیسویں زبور کا شکوہ اسی قسم کا " شکوہ" ہے جس قسم کا محمد عربی نے کیا تھا۔ جب قریش قرآن کو جھٹلاتے اور کہتے تھے کہ " قرآن ایک جھوٹ بات ہے جو محمد نے گھڑی ہے"(فرقان آیت ۵، ٦)" اور وہ پریشان خوابوں کا مجموعہ ہے"(انبیاء آیت ۵)اور " پہلے لوگوں کی کہانیاں " ہے۔ تب آپ نے درگاہِ الہٰی میں شکایت کی کہ " یا اللہ میری قوم نے قرآن کو ٹھہرایا جھک جھک "(فرقان آیت ۲۲) پھر جب حضرت محمد نے باشندگانِ طائف کو دعوتِ اسلام دی اور وہاں کے غنڈوں نے آپ پر پتھر برسائے جن کے ہاتھوں سے ایک

عیسائی نے آپ کو بچایا تو آپ نے شکوہ کرکے کہا - اے اللہ میں تیرے حضور اپنی ضعفِ قوت اور لاچاری کی نسبت عرض کرتا ہوں - اے ارحم الراحمین توہی بے چاروں کا چارہ اور میرا کارساز ہے۔ مجھ کو تو کس کے سپرد کرتا ہے؟ کیا تُرش رواجنبیوں کے اور دشمنوں کے"؟ جنگِ بدر کے روز آپ پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی اور آپ اللہ سے کہتے تھے -" یا اللہ اگر کافر فتح مند ہوگئے تو کفر پھیل جائیگا- اگر مسلمانوں کی یہ قلیل جماعت ہلاک ہوگئی توپھر کون تیری پرستش کرے گا؟ اے اللہ میں تیری رحمت سے فریاد چاہتا ہوں "-

بعینہ اسی طرح بائیسواں زبور ایک شکوہ ہے جو ایک پُردرد دل سے نکلتا ہے۔ مزمور نویس اپنی قوم اسرائیل کی زندگی کو چاروں طرف سے بُت پرست اقوام کے ہلاکت آفرین ہاتھوں میں پڑا دیکھ کر خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ اے قوم بنی اسرائیل کے خدا تونے اپنی قوم بنی اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا ہے؟ اسکے نالہ اور فریاد سے تو کیوں دُور رہتا ہے ؟ اے اسرائیل کے خدا تیری قوم شب وروز تیرے حضور گریہ وزاری کرتی ہے تو اس کی مدد کیوں نہیں کرتا ؟ تو اس قوم کا واحد خدائے قدوس ہے اور اس قوم کی حمدو ثنا تیرا تخت ہے۔ جس پر تو تخت نشین ہے۔ اگر یہ حمدو ثنا کی آواز خاموش ہوگئی تو تو کس تخت پر بیٹھیگا اور تیری پرستش کون کرے گا؟ اے اسرائیل کی قوم کے چارہ ساز اپنی قوم کی مدد کے لئے جلدی کر"(آیات ۱ ، ۳، ۱۹ )-

پس یہ آیت " شکوہ اربابِ وفا" ہے- یہ رازو نیاز کی باتیں ہیں- جو محب صادق اور محبوب کے درمیان اور " قید دستور سے بالا" ہوتی ہیں- یہ عاشق کا گلہ ہے جووہ معشوق سے کرتا ہے- کیونکہ عاشق صادق اور معشوق حقیقی میں عشق و محبت کا رشتہ ہے ان رازو نیاز کی باتوں کو معترض کی سی ذہنیت رکھنے والا کیا جانیں جن کی الٹی سمجھ اس عشق و محبت کے رشتہ کو" جدائی اور انفاک" سے تعبیر کرتی ہے ؟ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ یہ جدائی " منطقیانہ انفکاک" کی جدائی نہیں بلکہ نے کی جدائی ہے- جس کی نسبت مولانائے روم فرماتے ہیں -

| | |
|---|---|
| بشنواز نے چُوں حکایت میکند | وزجدائی ہاشکایت میکند |

حضرت مولانا مرحوم سچ فرماتے ہیں کہ

| | |
|---|---|
| محرم ایں ہوش جُز بے ہوش نیست | مرزباں رامشتری چوُں گوش نیست |

عاشق کے گلہ کی آواز معشوق حقیقی کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے-

بالفاظ مرحوم اقبال :

| | |
|---|---|
| دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے | پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے- |
| قُدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے | خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے |
| اڑکے آواز مری تابفلک جا پہنچی | یعنی اس گل کی مہک عرش تلک جاپہنچی |

جب عاشق کی یہ " فریاد" عرش معلےٰ تک جاپہنچی تو اللہ کی رحمت نے اپنی قوم اسرائیل کی " سن لی" اوراس کو" رہائی بخشی - جس کی وجہ سے اسرائیل کی قوم اس کی مداح خواں ہو کر یہ مصمم ارادہ کرلیتی ہے کہ وہ اقوام عالم کو اپنے معبود حقیقی کی بشارت دے کر رہے گی-(آیات ۲۱ تا ۳۱) پس زبور کا دوسرا حصہ معشوقِ حقیقی کی حمدو ستائش پر مشتمل ہے-

ہم معترضین کو تفسیر کاوہی سبق یاد دلاتے ہیں جو مرحوم مولوی صاحب نے مرزائیوں ، نیچری مسلمانوں وغیرہ کو پڑھایا تھا- آپ نے ان کو یہ سبق دیا تھا" قرآن مجید عربی زبان میں آیا ہے اس لئے اس کے صحیح معنے اور صحیح تفسیر وہی ہوگی جو عربی زبان میں آیا ہے اس لئے اس کے صحیح معنی اور صحیح تفسیر وہی ہوگی جو عربی زبان (صرف و نحو، لغت وغیرہ) کے موافق ہو- یہ قرآن مجید کی خصوصیت نہیں- ہر زبان کا صحیح ترجمہ اور صحیح مطلب وہی ہوتا ہے جو اس زبان کے صحیح محاورات کے مطابق ہو- اس اصول میں عربی، فارسی ، انگریزی وغیرہ سب مساوی ہیں- اس کے خلاف کا نام ہے تفسیر بالرائے یعنی جس تفسیر میں محض اٹکل پچو باتیں کی جائیں-ایسی تفسیر غلط اور بالرائے کہلاتی ہے "(تفسیر بالرائے صفحہ ۲)- تفسیر بالرائے نہ صرف غیر صحیح بلکہ حرام ہے-(صفحہ ۵) ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ مرحوم مولوی صاحب کا یہ فتویٰ یاد رکھیں-

ناظرین نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہماری تفسیر کی بنیاد عہدِ عتیق اور انبیائے سابقین کی زبان اور محاورات پر قائم ہے لہذا وہ صحیح ہے۔ لیکن مرحوم مولوی صاحب کی تفسیر محض تفسیر بالرائے ہے۔ پس وہ " اٹکل پچو باتیں" کرتے ہیں۔ لہذا ان کے اپنے فتوے کے مطابق مرحوم کی تفسیر" نہ صرف صحیح بلکہ حرام ہے"

# فصل دوم

## آیہ زیر بحث اورابنِ اللہ

### سیدنا مسیح نےاس آیت کی تلاوت کیوں کی؟

سطور بالامیں ہم ذکر کرچکےہیں کہ ۲۲ویں زبور میں ایک ایسے شخص کا شکوہ ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے اعمال کی سزا اور جزا ہم کو اسی دنیا میں ملتی ہے۔ پس وہ متعجب ہو کر یہ پوچھتا ہے کہ ایک قوم جو راستباز اور خدائے واحد کی اکیلی پرستش کرنے والی ہے کیوں پستی اور ذلت کی حالت میں مبتلا ہے اور بُت پرست اقوام کیوں خوشحال ہیں۔ حالانکہ پستی اور زبونی بُت پرستی کی سزا ہونی چاہیے اور عروج اوراقبال خدا پرستی کی جزا ہونی چاہیے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت کلمتہ اللہ اس قسم کے اعتقادات کے قائل نہیں تھے ہمارے نیک وبد اعمال کی جزا اور سزا ہم کو فقط اسی دنیا میں مل جاتی ہے (یوحنا ۹: ۳وغیرہ) پس جیسا ہم اوپر ثابت بھی کرچکے ہیں ۔ ۲۲واں زبور آپ کے اپنے روحانی تجربہ اور ذاتی روحانی حالت کا اظہار نہیں کرتا پس سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنخداوند نے صلیب پر سے آیہ زیرِ بحث کی تلاوت کیوں فرمائی؟

مولوی ثناء اللہ صاحب بھی اپنی اخبار اہلِ حدیث میں یہی سوال پوچھتےہیں اور فرماتے ہیں " سوال یہ ہے کہ مسیح نے صلیب پر جان دیتے ہوئے اسے کیوں پڑھا؟ قاعدہ یہ ہے کہ کوئی کلامِ سابق اس وقت پڑھا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنی حالت کو اس کے مطابق سمجھے۔ جب تک کسی واقعہ کو گذشتہ واقعہ کے مماثل نہ قرار دیا جائے پہلے واقعہ پر بولا ہوا کلام دوسرے واقعہ میں نقل نہیں ہوسکتا۔ حضرت مسیح کا تکلیف کے وقت زیر بحث انجیلی فقرہ اپنے حال پر چسپاں کئے بغیر پڑھنا بالکل غیر موزوں ہوگا"۔ (اہل حدیث ۵ جون ۱۹۴۲ء)

جواباً عرض ہے کہ:

ہم اپنے رسالہ " اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجئی "؟ میں یہ ثابت کرچکے ہیں کہ اہلِ یہود کی صحفِ مقدسہ کے مطالعہ سے ہم پر عیاں ہوجاتاہے کہ خدا نے قوم اسرائیل کو اس غرض سے چن لیا تھا کہ وہ اقوامِ عالم میں خدا کے علم اور نجات کی تبلیغ کرے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

پس خدا نے قومِ یہود میں اس اصول کے تحت خاص طور پر اپنا علم ودیعت کر رکھا تھا اوراس کے سپرد یہ خدمت کی تھی کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو خدا کی معرفت بخشنے اور نجات کا پیغام دینے کا وسیلہ ہو۔ تاکہ تمام دنیا کی جملہ اقوام اہلِ یہود کے ذریعہ ایک حقیقی واحد خدا کے نور سے منور ہوجائیں (یسعیاہ ۴۲: ۶ وغیرہ) قوم اسرائیل کے اس نصب العین کی وجہ سے منجئی عالمین نے اپنے کام اور پیغام کو ایک حد تک اہلِ یہود میں ہی محدود رکھا۔ آنخداوند کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اس خفتہ قوم کو بیدار کریں تاکہ اس کو اپنی ملی حیات کے اصلی نصب العین کا احساس ہوجائے اور وہ آپ کی انجیل پر ایمان لا کر دیگر اقوامِ عالم کو آپ کی نجات کی خوش خبری دینے کا وسیلہ بنے۔ اناجیل اربعہ کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ شروع شروع میں آنخداوند کو بڑی امید تھی کہ قوم اسرائیل آپ پر ایمان لے آئے گی( لوقا ۱۰ باب، یوحنا ۶: ۱، ۵ وغیرہ) لیکن تلخ تجربہ نے آپ کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔(مرقس ۲: ۲۰۔ ۸: ۲۷تا ۲۸۔ ۹: ۳۰، ۳۲۔ ۱۰: ۳۲تا ۳۴۔ متی ۲۳: ۲۹ تا ۳۶ وغیرہ) آپ محسوس کرتے تھے کہ بنی اسرائیل آپ کے حقیقی شاگرد ہوسکتے

ہیں( یوحنا ۸: ۳۱ تا ۳۲)اور خود سچائی سے واقف ہو کر اور نجات حاصل کرکے اقوام عالم کی نجات کا باعث بن سکتے ہیں (یوحنا ۴: ۲۲) لیکن اس نجات سے فیض یاب ہونے کے بجائے اہل یہود کی بے اعتقادی اور بے ایمانگی روز بروز ترقی کرتی گئی (یوحنا ۸: ۲۷، ۴۶ ۱۰: ۲۵، ۲۶ وغیرہ) اورچونکہ خدا کی محبت ان میں نہیں تھی( یوحنا ۵: ۴۲ وہ خدا کے فرزند ہونے کے بجائے شیطان کے فرزند ہوگئے( یوحنا ۸: ۴۲) منجئی عالمین کی قوم نے آپ کورد کردیا(متی ۲۱: ۳۳، ۴۵- ۲۲: ۵تا ۸- مرقس ۱۲: ۱تا ۱۰- لوقا ۱۴: ۱۶، ۲۴- ۲۰: ۹، ۱۷- یوحنا ۱: ۱۱- ۸: ۱۹، ۱۸: ۴۵تا ۴۷وغیرہ) اور وہ آنخداوند کو قتل کرنے کے درپے ہوگئے -(یوحنا ۵: ۱۶تا ۱۸- ۸: ۳۷- ۱۱: ۴۷تا ۵۳)-

کلمتہ اللہ کے دل میں اپنی قوم کے لئے تڑپ تھی- کیونکہ آپ کی محبت اہل یہود کے لئے غیر فانی تھی( متی ۲۳: ۳۷- لوقا ۱۳: ۳۴) آپ کےدل میں اس گردن کش قوم کے لئے جو خدا سے باغی تھے ایک درد تھا جو آپ کو چین لینے نہیں دیتا تھا- آپ اس قوم کی بے ایمانی پر بار بار نوحہ خواں ہوئے -(متی ۱۷: ۱۷- ۸: ۱۲- ۱: ۱۵- ۱۲: ۴۱، ۴۳ لوقا ۱۱ باب وغیرہ)-آپ کی نگاہ ہمیشہ بنی اسرائیل کے ان گمراہ لوگوں پر تھی جو آپ کے خیال میں" ان بھیڑوں کی مانند جن کا کوئی چرواہا نہ ہو خستہ حال اور پراگندہ تھے"(متی ۹: ۳۶ بالخصوص اپنی زندگی کے آخر میں یہودی قوم کا خیال آپ کو ہر وقت ستاتا تھا(متی ۲۰: ۳۲- ۲۱: ۱۲تا ۱۴- ۲۱: ۲۸تا ۳۲- ۲۱: ۳۳، ۴۶- ۲۲: ۱- ۱۲- ۲۳: ۱۳، ۳۶، ۲۳: ۳۷تا ۳۹ اور ۲۴ باب وغیرہ) ذرا خیال کرو کہ روئے زمین کی تاریخ میں ذیل کے حسرت ناک الفاظ اپنا ثانی کہیں رکھتے ہیں؟ منجئی عالمین یہودی قوم کومخاطب کرکے فرماتے ہیں -" اے[1] یروشلیم - اے یروشلیم ، تو جو نبیوں کو قتل کرتا اور جو تیرے پاس

[1] ناظرین نوٹ کریں کہ ان آیات میں بھی قوم یہود کے لئے صیغہ واحد استعمال کیا گیاہے۔( برکت اللہ)

بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتا ہے- کتنی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کرلیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کرلوں-مگر تم نے نہ چاہا- دیکھو تمہارا گھر تمہارے لئے ویران چھوڑا جاتا ہے- کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اب سے مجھے پھر ہر گز نہ دیکھو گے جب تک نہ کہو گے کہ مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے "-(متی ۲۳: ۳۷تا ۳۹)- " جب وہ (مسیح) ہیکل (بیت اللہ ) سے باہر جارہا تھا تو اس کے شاگردوں میں سے ایک نے اس سے کہا- اے استاد- دیکھ یہ کیسے کیسے پتھر اور کیسی کیسی عمارتیں ہیں- یسوع نے اس سے کہا تو ان بڑی بڑی عمارتوں کو دیکھتا ہے ؟ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا- جو گرایا نہ جائے "(مرقس ۱۳: ۱تا ۲) " جب اس (یسوع) نے نزدیک آکر شہر کو دیکھا تو اس پر رویا اور کہا کاش کہ تو اپنے[2] اسی دن میں سلامتی کی باتیں جانتا- مگر اب وہ تیری آنکھوں سے چھپ گئی ہیں - کیونکہ وہ دن تجھ پر آئیں گے کہ تیرے دشمن تیرے گرد مورچہ باندھ کر تجھے گھیر لینگے اور ہر طرف سے تنگ کریں گے اور تجھ میں کسی پتھر پر پتھر نہ چھوڑیں گے اس لئے کہ تونے اس وقت کو نہ پہچانا جب تجھ پر نگاہ کی گئی "(لوقا ۱۹: ۴۱تا ۴۴)-

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

منجئی عالمین اپنی زندگی کے آخری ہفتے میں اہل یہود کی برگشتگی پر بار بار اظہار تاسف کرتے (متی ۲۳ باب) اور قوم اسرائیل کی قسمت پر روتے تھے- اس آخری ہفتہ کے شروع میں جب آپ یروشلیم تشریف لے گئے توآپ نے ہیکل کو دیکھا جو یہود کی عبادت گاہ ہونی چاہیے تھی لیکن اس بد بخت قوم کےقائدین کی روحانیت کا یہ عالم تھا کہ :

ترک دنیا بمردو آموزند — خویشتن سیم وغلہ اندوزند

[2] اس مقام میں بھی قوم یہود کے لئے صیغہ واحد استعمال کیا گیا ہے ( برکت اللہ)

ان نام نہاد روحانی پیشواؤں کی حرص وآز نے بیت اللہ کو دعا کا گھر ہونے کے بجائے ڈاکوؤں کی کھوہ" بنا رکھا تھا(مرقس ۱۱: ۱۵تا ۱۸) منجئی عالمین کی غیرت کی آگ شعلہ زن ہوئی اور آپ نے "ہیکل میں داخل ہوکر ان سب کو نکال دیا جو ہیکل میں خرید وفروخت کررہے تھے اور صرافوں کے تختے اور کبوتر فروشوں کی چوکیاں الٹ دیں اور ان سے کہا لکھا ہے کہ میرا گھرا اقوام عالم کے لئے دعا کا گھر کہلائے گا مگر تم اسے ڈاکوؤں کی کھو بناتے ہو"( مرقس ۱۱: ۱۵) قسی القلب سردار کاہن خدا سے اس قدر باغی ہوگئے تھے کہ اپنی اصلاح کرنے کے بجائے الٹا ابن للہ کو" ہلاک کرنے کا موقعہ ڈھونڈنے لگے"( مرقس ۱۱: ۱۸) قوم یہود اوراس کے باغی پیشواؤں کی روحانیت اس قدر گرچکی تھی کہ وہ چوروں ، ڈاکوؤں اور بھیڑیوں کی طرح ہوگئے تھے( یوحنا ۱۰ باب) ان کی حالت بے پھل انجیر کے درخت کی مانند ہوگئی تھی( متی ۲۱: ۱۹) جس کا مقابلہ حضرت میکاہ نے اپنے زمانہ کے قوم یہود کے روحانی افلاس سے کرکے فرمایا تھا۔ کہ اس قوم میں راست باز شخص شاذو نادر ہی ملتا ہے جس طرح بے پھل انجیر میں کوئی " گچھا نہیں ہوتا" (۷: ۱تا ۶۔ متی ۲۳باب) آپ اپنی قوم کی بڑی بھیڑ دیکھتے تھے اور آپ کو لوگوں پر ترس آتا تھا" کیونکہ وہ ان بھیڑوں کی مانند جن کا چرواہا نہ ہو خستہ حال اور پراگندہ تھے" (متی ۹: ۳۶) اسی قسم کے خیالات ابن اللہ کے آخری ایام میں آپ کے دل میں مکذب اور مکفر قوم یہود کے روسا کی بابت لگا تار آرہے تھے جب آپ کوہ کلوری کو مصلوب ہونے کے لئے جارہے تھے تو" لوگوں کی ایک بڑی بھیڑ اور بہت سی عورتیں جو اس کے واسطے روتی پیٹتی تھیں اس کے پیچھے پیچھے چلیں " منجئی عالمین نے جو الفاظ اپنی زبان صداقت بیان سے فرمائے وہ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ گویہ سب گریہ وزاری ۔ آہ ونالہ ، بکاہ وفغاں آپ کی خاطر ہورہا تھا تاہم اس نازک وقت میں بھی جب آپ صلیب کے بوجھ کے نیچے لڑک کھڑا رہے تھے آپ کو اپنا خیال مطلق نہیں تھا بلکہ قوم اسرائیل کے حشر کا خیال آپ کو ستا رہا تھا چنانچہ آپ نے ان عورتوں کو ارشاد فرمایا " اے یروشلیم کی بیٹیو! میرے لئے نہ روؤ بلکہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے روؤ۔ کیونکہ دیکھو وہ دن آتے ہیں جن میں کہیں گے مبارک ہیں وہ بانجھیں اور وہ رحم جو بارور نہ ہوئے اور وہ چھاتیاں جنہوں نے دودھ نہ پلایا۔ اس وقت وہ پہاڑوں سے کہنا شروع کریں گے ۔ کہ ہم پر گر پڑو اور ٹیلوں سے کہ ہمیں چھپالو۔ کیونکہ جب ہرے درخت کے ساتھ ایسا کرتے ہیں تو سوکھے کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا جائیگا۔"( لوقا ۲۳: ۲۷تا ۳۱) منجئی عالمین کے یہ الفاظ حضرت ہوسیع نبی کے صحیفہ میں وارد ہوئے ہیں۔ جہاں یہ رسولِ قوم یہود کی روحانی پستی اور ذلت کا حال بیان کرکے اسرائیل کی قوم کی حالت پر واویلا کرتا ہے۔( ۱۲: ۱تا ۸) یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ ایسے نازک وقت میں بھی جب لوگوں کی نظر ان کے اپنے دکھوں اور مصیبتوں پر قدرتی طور پر لگی ہوتی ہے ابن اللہ کی نگاہ اپنے مصائب اور اذیت پر نہیں بلکہ اپنی قوم کے روحانی افلاس اور پستی پر تھی۔ اورآپ قوم کی حالت دیکھ کر متاسف تھے۔

جب ہم کوہ کلوری کے باقی دو مصلوبوں کی حالت کا منجئی عالمین کی حالت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں تو یہ نمایاں فرق ہم پر فوراً ظاہر ہوجاتا ہے۔ ان کی نظر ان کے جسمانی عذاب اور سزا کی جانب لگی ہے لہذا وہ صلیب پر کراہ کراہ کر اور دوسروں پر لعنت کرکے جان توڑ رہے ہیں(متی ۲۷: ۴۴) لیکن منجئی عالمین کی نظر آپ کے جسمانی دکھوں پر نہیں تھی بلکہ قوم اسرائیل کی سرکشی اور برگشتگی پر لگی تھی۔ جب آپ کے ہاتھوں میں کیل ٹھونکے جارہے تھے۔ آپ نے قوم اسرائیل کے لئے دعائے مغفرت مانگی( لوقا ۲۳: ۳۴) جب آپ مصلوب ہوئے توآپ کو صلیب کے جسمانی عذاب اور شرم کی پروانہ تھی (عبرانیوں ۱۲: ۲) بلکہ صلیب پرآپ کی نگاہ اپنی قوم بنی اسرائیل کے حسرتناک انجام اوراس کے خوفناک مستقبل پر لگی تھی۔آپ نے اپنے دل میں خیال فرمارہے تھے کہ اس قوم کا کیا حشر ہوگا جو خدا کے " انبیاء کو کوڑے مارتی ۔ شہر بشہر ستاتی، سنگسار کرتی اور مصلوب اور قتل کرتی چلی آئی ہے( متی ۲۳: ۲۹تا ۳۷) قوم اس کی روحانی پستی ، اور زبونی کی حالت کو دیکھ کر ابن اللہ کو بائیسواں زبور یاد آیا۔ کیونکہ قوم یہود کی موجودہ حالت مزمور نویس کے زمانہ کی حالت جیسی ہوگئی تھی ۔ پس آپ نے دونوں زمانوں کے قومی زوال میں مماثلت دیکھ کر اپنی زبانِ صداقت

بیان سے بڑی آواز سے چلا کر کہا۔ ایلی ۔ ایلی ۔ لما شبقتنی یعنی اے قوم اسرائیل کے خدا۔ اے قوم اسرائیل کے خدا تونے اپنی قوم کو کیوں چھوڑدیا؟ تونے اس قوم کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ تیرے نام اور نجات کو دنیا کی کل اقوام تک پہنچائے۔لیکن یہ قوم نہ صرف اپنے فرض ادا نہیں کرتی بلکہ تیرے مسیح کو بھی مصلوب کررہی ہے۔ اے باپ تو اس قوم کو معاف کر کیونکہ اس قوم کے لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کررہے ہیں ۔(لوقا ۲۳: ۳۴۔ متی ۲۷: ۴۶ وغیرہ)۔

اناجیل اربعہ کا مطالعہ ظاہر کردیتا ہے کہ آنخداوند کو مزامیر حفظ تھے۔ اگر آپ کو اپنے دکھوں اور اذیتوں ہی کا خیال ہوتا توآپ دیگر زبوروں کی تلاوت فرماسکتے تھے۔ جو جسمانی اذیت اور عقوبت کے وقت ان کی اپنی تسلی کا باعث ہوسکتے تھے۔ مثلاً آپ جانکنی کے موقعہ پر زبور ۲۳: کے الفاظ کو دہرا سکتے تھے۔"خداوند میرا چوپان ہے۔۔۔۔مجھے کمی نہ ہوگی ۔۔۔۔بلکہ خواہ موت کے سایہ کی وادی میں سے میرا گزر ہو میں کسی بلا سے نہیں ڈرونگا کیونکہ تو (اے خداوند ) میرے ساتھ ہے۔۔۔۔ میں ہمیشہ خداوند کے گھر میں سکونت کروں گا"۔ لیکن حضرت ابن اللہ نے نہ تو اس زبور کی اور نہ اس قسم کے کسی دوسرے زبور کی صلیب پر سے تلاوت فرمائی کیونکہ منجئی عالمین کو صلیب پر اپنے جسمانی عذاب کا خیال تک نہ تھا بلکہ آپ کو اپنی قوم کے عبرتناک حشر کا خیال دامنگیر تھا۔ چونکہ ابن اللہ مجسم محبت تھے اور محبت اپنی خودی پر دھیان نہیں کرتی (۱ کرنتھیوں ۱۳: ۵) پس ابنِ اللہ صلیب پر اپنے دکھوں پر نہیں ۔ بلکہ قوم اسرائیل کے حسرت ناک انجام کا خیال فرمارہے تھے۔ مقدس پولوس رسول اس عجیب ماجرے سے متاثر ہو کر فلپیوں کی کلیسیا کو نصیحت کرکے فرماتا ہے۔" ہر ایک اپنے اہی احوال پر نہیں بلکہ ہر ایک دوسروں کے احوال پر بھی نظر رکھے ۔ ویسا ہی مزاج رکھو جیسا مسیح یسوع کا بھی تھا"(فلپیوں ۲: ۴تا ۵)منجئی عالمین نے موت کی تلخی اور جان کنی کی حالت میں اپنا خیال نہ کیا( رومیوں ۱۵: ۳) اور" اپنے احوال پر نظر " نہ کی بلکہ قوم اسرائیل کا حشر اور مستقبل آپ کی نظروں کے سامنے تھا( جس طرح گزشتہ زمانہ میں وہ مزمور نویس کے سامنے تھا) پس مزمور نویس کے ہم خیال ہو کرآپ نے اس کے الفاظ کو دہرایا اور آیہ زیر بحث کی تلاوت کرکے فرمایا" ایلی ۔ ایلی ۔ لما شبقتنی " چنانچہ آبائے کلیسیاء میں سے ایک بزرگ لکھتا ہے[1] ۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ تونے قوم اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا کہ وہ تجھ سے اس حد تک برگشتہ ہوگئی ہے کہ تیرے بیٹے کو مصلوب کررہی ہے۔

ادھر منجئی عالمین کو اہل یہود کی برگشتگی کی وجہ سے ۲۲ویں زبور کی پہلی آیت یاد آئی۔ اور ادھر یہودی قوم کے زعماء اور قائدین اسی زبور کے الفاظ (آیت ۷، ۸) میں ابن اللہ کا مضحکہ کررہے تھے۔ چنانچہ انجیل متی میں وارد ہے کہ" سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے سے کہتے تھے۔اس نے اوروں کو بچایا۔ اپنے تئیں نہیں بچاسکتا۔ اس نے خدا پر بھروسہ کیاہے۔اگر وہ اسے چاہتا ہے تو اب اس کو چھڑالے"(زبور ۲۷: ۴۱تا۴۳، لوقا ۲۳: ۳۵) ابنِ اللہ کا دل اہل یہود کی بے اعتقادی کے باعث پہلے ہی چھلنا پڑا تھا۔ ان الفاظ نے دل کےزخم پر نمک پاشی کا کام کیا۔ کیونکہ اب اس قوم کے سردار کاہن تک خدا پر بھروسہ رکھنے کو الٹا ایک طعنہ کا امر قرار دے رہے تھے۔ حالانکہ ان کا فرض منصبی یہ تھا کہ ایسی حالت میں لوگوں کو خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

پس آنخداوند نے " بڑی آواز سے چلا کر فرمایا" اے بنی اسرائیل کے خدا۔ اے بنی اسرائیل کے خدا تونے قوم اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا ہے کہ اس کے سردار کاہن تک تجھ سے اس قدر باغی ہوگئےہیں کہ تجھ پر بھروسہ رکھنا بھی معیوب بات خیال کرتےہیں اور تیرے مسیح کو مطعون گردانتےہیں؟( مقابلہ کروزبور ۶۹: ۹وغیرہ)۔

[1] Commentary on St. Mark (Collection of the works of Fathers. By. Thomas Aquinas)

سردار کاہنوں نے صرف طعنے دینے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ انہوں نے ۲۲ویں زبور کی مختلف آیات میں جن مصائب وآلام کا ذکر ہے ان کا آپ کو نشانہ بنا کر چھوڑاتا کہ حدیکہ صلب پر آپ کی بیرونی اور خارجی حالت عین اس زبور کے مصداق ہو گئی۔ مثلاً صلیب پر آپ کے مبارک ہاتھوں اور پاؤں کو چھیدا گیا(زبور ۲۲آیت ۱۶ ۔مرقس ۱۵: ۱۳، ۱۴، ۲۴) صلیب پر آپ کے جسم اطہر اور ہڈیوں کو کھینچا اورتانا گیا۔ (آیت ۱۴، متی ۲۷: ۳۵) آپ کے کپڑوں پر قرعہ ڈالا گیا۔ آیت ۱۸، ومرقس ۱۵: ۲۴ ۔یوحنا ۱۹: ۲۳، ۲۴ آپ کی اذیت کی حالت میں آپ کو تاکا اور گھورا گیا۔ (آیت ۱۷ ومتی ۲۷: ۴۳۔ لوقا ۲۳: ۳۴، ۳۵) آپ کے دشمنوں نے آپ کو دلخراش طعنے سنائے (آیت ۷، ۸ ۔ متی ۲۷: ۳۹تا ۴۴)۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ قدرتی طور پر آنخداوند کے ذہن میں ۲۲ویں زبور کی پہلی آیت آئی اورآپ نے اس کی تلاوت فرما کر قوم یہود کی برگشتگی پر اظہارِ تاسف فرمایا اورکہا ۔ اے قوم اسرائیل کے خدا۔ اے قوم اسرائیل کے خدا۔ تونے قوم اسرائیل کو کیوں چھوڑ دیا؟"۔

منجئی عالمین کی جو بیرونی حالت صلیب پر تھی اس کی مطابقت اس زبور کے ساتھ اس حد تک ہے کہ آبائے کلیسیاء میں سے ایک بزرگ ٹرٹولین[1] کہتاہے کہ" یہ زبور مسیح کے دکھوں پر مشتمل ہے"۔ دور حاضرہ میں بھی مسیحی کلیسیا اس کو مبارک جمعہ کے روز پڑھتی ہے جب وہ منجئی عالمین کی مبارک موت کی یادگاری کرتی ہے اور عبرانیوں کے خط کا مصنف آیات ۲۲تاآخر کا اطلاق ابن اللہ پر کرتاہے۔ کیونکہ یہ زبور امید اور محبت کے الفاظ پر ختم ہوتاہے۔(۲باب)۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اس زبور کی کسی آیت میں بھی زبور ۵۱ کی طرح گناہ کا اقرار موجود نہیں۔ اور نہ اس کی کسی آیت میں دشمنوں پر لعنت کی گئی ہے پس اگر حضرت

[1] Ad Marcion iii

کلمتہ اللہ نے اپنی جانکنی کی حالت میں تمام کے تمام مزمور کی تلاوت کی بھی ہو تو جائے تعجب نہیں ۔ کیونکہ آپ کو یہ احساس تھا کہ اس مزمور اور یسعیاہ نبی کے صحیفہ کے " خادم یہوواہ" اور کتاب حکمت ۲: ۱۲ تا ۲۰ آیات میں راستباز کے جن دکھوں کا ذکر ہے وہ آپ کی ذاتِ قدسی صفات میں بدرجہ احسن پورے ہورہے ہیں۔

ہم نے مرحوم مولوی صاحب کے سوال کا تشفی بخش جواب صحیح اصولِ تفسیر کے مطابق دینے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تمام متلاشیانِ حق پر اب واضح ہوگیا ہوگا کہ منجئی کونین نے صلیب پر جان دیتے ہوئے آیہ زیر بحث کو کیوں پڑھا؟ اس آیہ شریفہ کی مندرجہ بالا تاویل صرف صحیح اصول تفسیر پر مبنی ہے۔ یہ تفسیر مزمور نویس کے خیالات کا صحیح نقشہ ہے اور ۲۲ویں زبور کے قرائن اور سباق وسیاق اس کے حامی ہیں۔ یہ تفسیر آنخداوند کے خیالات ، کلمات اور جذبات اور معتقدات کے مطابق ہے اور آپ کی روحانی حالت اور تجربہ۔آپ کا حقیقی منشا اور مطلب آپ کا پروگرام اور طرز عمل سب اس تفسیر کی تصدیق کرتے ہیں۔ کتب مقدسہ کی زبان، الفاظ اور محاورات سے اس کی تائید ہوتی ہے اورانجیل جلیل کی آیات محکمات جن کا فکر باب دوم میں کیا گیا ہے اس تفسیر کی موید ہیں۔ پس ہماری مرحوم کی تاویل کی طرح تفسیر بالرائے نہیں ہے۔ بلکہ صحیح تفسیر ہے جو صرف صحیح اصول پر مبنی ہے۔

## اختلاف قرات

مولوی ثناء اللہ صاحب باوجود دعویٰ ہمہ دانی (صفحہ ۳۸) مسیحیت کی کُتب مقدسہ سے اس درجہ نابلد ہیں کہ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کُتب کس زبان میں لکھی گئیں تھیں۔اور مناظر ہونے کے باوجود وہ بچارے ان زبانوں سے بھی آشنا نہیں۔ پس ہم ان سے یہ امید نہیں کرسکتے کہ وہ انجیل کی مختلف قراتوں اور ترجموں سے واقف ہوں۔ ہم ناظرین کی واقفیت کی خاطر آیت زیرِ بحث کی مختلف قراتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(الف۔) آرامی قرات۔ ہم باب دوم میں بتلاچکے ہیں ۔ کہ آنخداوند کی مادری زبان آرامی تھی۔ پس اصل انجیل جو اس زبان میں لکھی گئی تھی وہ کلمتہ اللہ کے کلمات طیبات پر خاص طور پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس انجیل میں یہ آیہ شریفہ یوں ہے[1] ۔

" اے میرے خدا۔اے میرے خدا۔ میں اس گھڑی کے لئے پیدا ہوا تھا"۔

یہ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کا اعتراض اس قرات پر سرے سے وارد نہیں ہوسکتا۔ اس قرات کے ساتھ یوحنا ۱۲ : ۲۷ کے الفاظ کا مقابلہ کرو:

(ب۔)" اے میرے خدا ۔ اے میرے خدا۔ تونے مجھے کیسا جلال بخشا۔"

(ج۔) " اے میرے خدا۔ اے میرے خدا۔ تونے مجھے کیوں رسوا ہونے دیا۔"

مذکورہ بالا دو نو قرائیتں کتاب Mission and Message of Jesus کے صفحہ ۱۹۶ پر درج ہیں آپ کا اعتراض ان دونوں قراتوں پر بھی وارد نہیں ہوسکتا۔

(د۔) ایک اور قرات ہے جو یہودی عالم ڈاکٹر مونٹی فیوری مرحوم (Montefiori) نے اپنی تفسیر اناجیل ثلاثہ پر لکھی ہے اور وہ یہ ہے ۔" اے میرے خدا ۔ اے میرے خدا تونے مجھے کیوں طعن اور تشنیع کا نشانہ ہونے دیا"۔ مرحوم لکھتے ہیں کہ اس قرات کو جرمن نقاد ڈاکٹر ہارنیک درست تسلیم کرتا ہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کا اعتراض اس قرات پر وارد نہیں ہوتا۔

(ہ۔) " اے میرے خدا ۔ اے میرے خدا تونے مجھے کیوں چھوڑ دیا "؟ ہم نے سطور بالامیں ثابت کردیا ہے کہ مولوی صاحب کا اعتراض جو آپ نے اس قرات پر کرتے ہیں باطل ہے کیوں کہ آپ نے اس اعتراض کرنے میں ہر صحیح اصولِ تفسیر کو طاقِ نسیان پر رکھ دیا ہے۔

[1] See Lam sa, the Four Gospels.

چوں بشنوی سخن اہلِ دل مگو کہ خطاست

سخن شناس نہ دلبرا خطا ایں جاست

## آیہ زیرِ بحث اور مسئلہ کفارہ

مرحوم ثناء اللہ نے اپنے اعتراض میں جو اس رسالہ کے باب اول میں نقل کیا گیا ہے۔آیہ زیر بحث" ایلی ۔ ایلی ۔ لما شبقتنی کو مسئلہ کفارہ سے متعلق کیا ہے۔

ہمیں اس بات پر تعجب آتا ہے کہ آپ جیسے کہُنہ مشق اور سال خوردہ مصنف نے کس منطق کی روسے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ آیت مسئلہ کفارہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس آیت میں بلکہ سیاق وسباق کی پوری عبارت اور باب میں گناہ یا گناہ کے بوجھ کا یا کفارہ کا ذکر تک نہیں ملتا۔ اگر یا بالفرض محال مولوی صاحب کے اعتراض کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم بھی کرلیا جائے کہ " خدا نے مسیح کو ترک کردیا تھا"۔ تو بھی ہم کوکہیں اس بات کا نام ونشان نظر نہیں آتا کہ اس کے ترک کردینے کا باعث دنیا کی نافرمانی اور گناہ تھا اور کہ خدا باپ نے اپنے بیٹے کو جہان کے گناہ کی سزایوں دی کہ اس کو" چھوڑ دیا" ۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے توآپ مسیحی کفارہ کا مفہوم سرے سے نہیں سمجھے۔ مسیحی عقیدہ یہ نہیں ہے کہ مسیح کو صلیب پر دنیا کے گناہوں کی سزا ملی بلکہ کفارہ کا عقیدہ یہ ہے کہ " مسیح ہمارے گناہوں کے لئے موا"۔ ( ۱ کرنتھیوں ۱۵ : ۳) " مسیح بے دینوں کی خاطر موا"۔ جب ہم گنہگار ہی تھے۔ مسیح ہماری خاطر" موا" ۔ " خدا سے اس کے بیٹے کی موت کے وسیلے سے ہمارا میل ہوگیا۔" (رومیوں ۵: ۶، ۸، ۱۰ وغیرہ) ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن معترض " دنیا کے نور" کی دشمنی میں روشنی سے دور جا پڑے ہیں۔

اگر اس آیہ شریفہ کا تعلق مسئلہ کفارہ سے ہوتا تو مقدس پولوس یا مقدس پطرس یا مقدس یوحنا یا انجیلی مجموعہ میں سے کوئی مصنف تو اس کو اپنی مختلف تحریروں یا تقریروں میں مسئلہ کفارہ کے ثبوت میں پیش کرتا ۔ انجیل جلیل کی کُتب مقدسہ میں سے کتاب اعمال الرسل

اور مکتوبات کی ایک ایک سطر پڑھ لو تم کو اس قسم کا کوئی فقرہ یا کلمہ نہیں ملیگا۔ جس سے اس باطل نتیجہ کو تقویت مل سکے۔ ان سب کی معنی خیز خاموشی یہ ثابت کررہی ہے کہ آیہ زیر بحث کا مسئلہ کفارہ کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ جب معترض کے استدلال کی بنیاد انجیل جلیل کی کسی ایک آیت پر بھی نہیں تو ان کی ضد اور ہٹ دھرمی میں کیا شک رہ گیا۔ ھاتو برھانکمہ ان کنتمہ صادقین۔

## آیہ زیر بحث اور مسئلہ تجسم

ہم نے باب اول میں مولوی صاحب کے اعتراضات کو نقل کیا ہے کہ جو آپ نے اس آیہ شریفہ پر کئے ہیں۔ آپ اپنی کتاب" اسلام اور مسیحیت" میں بڑے طمطراق کے ساتھ کہتے ہیں۔"ہم پادری برکت اللہ صاحب اینڈ پارٹی اوران کی معرفت کل مسیحی دنیا سے سوال کرتے ہیں کہ انجیل متی کا یہ فقرہ کہ" مسیح نے صلیب پر چلا کر جان دی"۔ اس چلا کرجان دینے کے وقت بھی مسیح مجسم خدا تھا یا نہیں اوراس میں اور خدا میں کوئی مغائرت تو نہ تھی پھر چلا کر جان کس نے دی؟ یہاں پہنچ کر ہم تو رک جاتے ہیں آپ ہی بتائیے کہ وہ کون تھا؟ع" اگر تم زبان سوز"(صفحہ ۶۶) ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ مولوی صاحب یہ خیال کرتے ہیں کہ مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ نعوذ باللہ خدا مصلوب کیا گیا۔ اعتراض ظاہر کرتا ہے کہ یہ بیچارے نرے مولوی ہی ہیں اور مسیحی عقائد کے علم اور تاریخ سے بالکل کورے ہیں۔ان کو کیا معلوم کہ انیس سو سال سے جمہور کلیسیائے جامع نے اس قسم کے نظریہ کو کفر قرار دے دیا ہوا ہے۔ مولانا نے مسئلہ تجسم اور الوہیت مسیح کو سمجھا ہی نہیں۔ہم نے مانا کہ آپ ان مسائل کو نہیں مانتے لیکن آپ کو ان مسائل (جن پر آپ اعتراض کرتے ہیں) کے سمجھنے کی کم از کم کوشش تو کرنی چاہیے۔آپ میری کتابوں کو جہاں اس مسائل کا ذکر کیا گیا ہے غور سے دوبارہ پڑھیں تب آپ پر واضح ہوجائے گا کہ یہ اعتراض مسیحیت پر سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں ہم معترضین کی توجہ بالخصوص اپنی کتاب توضیح العقائد کے پہلے چند ابوب کی جانب مبذول کرتے ہیں۔

اگر مرحوم نے میری کتاب" دین فطرت۔ اسلام یا مسیحیت" اور رسالہ مسیحیت کی عالمگیری "(جن کا جواب وہ لکھنے بیٹھے تھے) بغور مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم کس معنی میں خدا کو" غالب علی الکل یاقدرتوں اور طاقتوں کا مالک مانتے ہیں۔ وہ خود دیکھ لیتے کہ ان کا یہ مایہ ناز اعتراض (جس کا بتکرار اعادہ کیا جاتا ہے) بالکل بے معنی رہ جاتا ہے لہذا ہم آپ کی توجہ پھر اول الذکر کتاب کے صفحہ ۳۴ اور موخر الذکر کتاب کے صفحہ ۱۳۱ کی طرف مبذول کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ عاقل را اشارہ کافی است۔ ہم نے ان کی کتاب میں بہتیرا ڈھونڈا کہ کہیں انہوں نے ان صفحوں کے مضمون پر کچھ لکھا ہو۔ لیکن آپ نے ہر جگہ اس اہم اور بنیادی نکتہ کو نظر انداز کردیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے اس کا کوئی جواب بن نہیں پڑا اور یا "طبعیت کی کمزوری اور عوارض کی کثرت" نے ان کو اپنے مخاطب کے نظریہ کو یہ سمجھنے کی فرصت نہیں دی تھی۔

اگر کتاب" اسلام اور مسیحیت" خاکسار کی کتابوں کے جواب میں لکھی گئی تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ مولوی صاحب نے ان اہم مسائل کفارہ اور تجسم کا ذکر کرتے وقت ہماری تصنیف کردہ کتابوں کو نظر انداز کرکے دیگر مناظرین کی کُتب کو لے کر ان پر مفصل بحث کی ہے؟ مثلاً الوہیت مسیح کی بحث میں آپ نے ایک قدیم مسیحی گیت پر (جو ڈیڑھ ہزار سال ہوئے لکھا گیا تھا اور جس کا ذکر تک میری کُتب میں نہیں آتا) بحث کی ہے۔(صفحہ ۵۶تا۵۷) اور پادری فنڈر کی کتاب میزان الحق مطبوعہ ۱۸۹۲ء کا (صفحہ ۵۹) پادری ہیئرس کی کتاب کا (صفحہ ۵۶تا۵۷) رئیس المناظرین پادری عبد الحق صاحب کے رسالہ اثبات التثلیث کا (صفحہ ۶۱تا۶۳ ، ۲۰۱ وغیرہ) رسالہ اخوت کا (صفحہ ۶۵) مرحوم ڈپٹی عبداللہ آتھم صاحب کی جنگ مقدس کا (صفحہ ۶۷) اقتباس کرکے ان کی عبارتوں پر اعترض کئے ہیں۔ اسی طرح کفارہ کی بحث میں آپ نے پادری گولڈسیک کی کتاب(صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۱) رسالہ المائدہ کا

صفحہ (۱۲۳) مرحوم پادری ٹامس ہاول کی کتاب کا صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۴) کا ذکرکے ان پر اعتراض کئے ہیں اور پھر خاکسار سے ان کے جواب کا مطالبہ کرتے اور مجھے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ "پادری برکت اللہ صاحب۔ بقول گونگے کی بولی گونگے کی ماں سمجھے آپ ہی بتلائیے وغیرہ وغیرہ " صفحہ ۱۲۴ " پادری گولڈ سیک کا یہ قول پادری برکت اللہ صاحب کو بھی مسلم ہونا چاہیے۔ اس لئے اب پادری صاحب ہمارے سوالات ٹھنڈے دل سے سن کر ان پر غور کریں وغیرہ وغیرہ" صفحہ ۱۲۰ " پادری عبدالحق صاحب چونکہ منطقی تقریر کیا کرتے ہیں۔اس لئے ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ" (صفحہ ۶۱)۔

ناظرین خدارا آپ ہی بتلائیے مولوی صاحب ان اصحاب کا جواب لکھنے بیٹھے تھے یا خاکسار کی کتابوں کا جن کو آپ نے کفارہ اور تجسم کی بحث کے دوران میں بالکل نظر انداز کردیا ہے؟ آپ تو ہم کو آدابِ مناظرہ سکھانے چلے تھے(صفحہ ۱۲، ۱۴، ۱۵) کیا مناظرہ اور مباحثہ کے آداب یہی ہیں ؟ اگر آپ ہماری کُتب کو نظر انداز نہ کرتے تو ہم کو آپ سے ان کو دوبارہ بغور مطالعہ کرنے کی ناگوار درخواست نہ کرنا پڑتی۔ اور اگر آپ نے میری دیگر کُتب کو بھی دیکھ لیا ہوتا تو آپ کو اپنی " عمر کی آخری منزل" میں چند ایک بوسیدہ اعتراضات کو اپنی کتاب میں بار بار دہرانے کی ضرورت نہ پڑتی۔ مثلاً اگرآپ نے میرا رسالہ" اسرائیل کا نبی یا جہان کا منجی "؟ (جس کا ذکر میں نے " مسیحیت کی عالمگیری" کے دیباچہ میں کیا تھا) دیکھا ہوتا تو آپ مرقس ۷: ۲۴ تا ۳۰ اور متی ۱۵: ۲۱تا ۲۸ پر اعتراض کرنے کی بار بار زحمت نہ اٹھاتے (صفحہ ۲۲، ۱۵۷ و ۲۰۵ وغیرہ) پھر اگر آپ نے میری کتاب " کلمتہ اللہ کی تعلیم" (جس کا ذکر" مسیحیت عالمگیری " کے دیباچہ (صفحہ ۶) میں کیا گیا ہے ) پڑھا ہوتا۔ تو آپ کو مسیحیت اور شریعت پر بار بار بحث نہ کرنا پڑتی (صفحہ ۱۳، ۸۸ تا ۹۲، ۱۳۷ وغیرہ)۔

## مولوی صاحبان سے اپیل

ہم نے مولوی ثناء اللہ صاحب اوران کے ہم خیالوں کو آیہ زیر بحث کی صحیح تفسیر سنا کر ان پر اتمام حجت کردی ہے پس ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ہم ان سے پھر ایک بار اپیل کریں کہ وہ اس سوء ادبی ، تضحیک اور توہین کے لئے اور ان ناسزا کلمات کے لئے جوانہوں نے حضرت کلمتہ اللہ وروح اللہ کے حق میں اپنی من گھڑت تاویل کے زیر اثر روا رکھتے ہیں بارگاہِ ایزوی میں خشوع وخضوع کے ساتھ توبہ کرکے خدا سے معافی کے طلبگار ہوں۔ روزِ حشر جس خدا کے سامنے وہ جائینگے وہ ان کو مخاطب کرکے تنبیہ کرتا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ أَنَّى يُصْرَفُونَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ

ترجمہ: یعنی کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالا کرتے ہیں کدھر کو بھکے چلے جارہے ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو کتاب جو جھٹلاتے ہیں اور ان کتابوں اور صحیفوں کو بھی جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں اور نبیوں کی معرفت بھیجے ہیں۔ سوآخر کار ان کو اس جھٹلانے کا نتیجہ معلوم ہوجائیگا۔ جب کہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے ۔اور طوق کے علاوہ زنجیریں۔ پانی پلانے کے لئے گھسیٹتے ہوئے ان کو جلتے پانی میں لے جائیں گے۔ پھر آپ میں جھونکنے جائینگے۔ (سورہ مومن آیات ۳۷تا ۷۵)۔

مولوی صاحب نے فرمایا ہے " یہودی مسیح کے حق میں اپنی ناراضگی کا اظہار ایسے سنگین لفظوں میں کرتے تھے کہ ع " اگر گوئم زباں سوزہ" صفحہ ۳۹۔ لیکن اس پر بھی آپ نے ناشائستہ الفاظ اپنے قلم سے نکالے۔آپ نہ صرف یہود کے " سنگین لفظوں " کو بلکہ مرزائے قادیانی کو بھی (جو بقول آپ کے " دُرشت کلامی میں مہارت نامہ رکھتے تھے"۔اہلِ حدیث ۱۵ مئی ۱۹۴۲ ءمات کرگئے۔ کیونکہ جہاں تک ہم کو ان کی تصنیفات پڑھنے کا ناگوار اتفاق ہوا

ہے سب نے اپنے اعتراضات کو" الفاظ کی شکل" (صفحہ ۱۰۷) تک ہی محدود رکھا تھا۔ کسی کے ہذیان نے آپ کی طرح اس سے تجاوز کرکے ایک گھنونی" تصویر کی شکل" (صفحہ ۱۰۷) اختیار نہ کی تھی۔

ہم پیروی قیس نہ فرہاد کرینگے
ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کرینگے

مولوی صاحب نے اپنی کتاب" اسلام اور مسیحیت " میں مسیح مصلوب کی ایک نہایت بھونڈی اوردل آزار تصویر شائع کی تھی(صفحہ ۱۰۹) جس پر ہم نے اخبار اُخوت لاہور میں میں صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ لیکن مولوی ثناء اللہ صاحب اپنے شرمناک فعل پر نادم ہونے کے بجائے " عذر گناہ اور بدتر از گنا" نہایت بے باکی سے فخر یہ کہتے ہیں " اس تصویر میں مسیح کو مولویانہ شکل میں دکھایا گیاہے۔مثلاً داڑھی گھنی، مونچھیں شرعی اور سر پر بال رکھے ہوئے اچھی صالحانہ شکل نظر آتی ہے ۔" (اہل حدیث ۲۶ فروری جون ۱۹۴۲ء) قادیانیوں نے بدیں خیال کہ مبادا مولوی ثناء اللہ مسیح کی توہین میں ہم سے سبقت لے جائے قادیان کے سرکاری گزٹ الفضل میں اس کو شائع کردیا کیونکہ بحکم اھل بیت اعرف فی البیت (گھر والے گھر کی بات جانتے ہیں ) یہ دونوں ایک دوسرے کے باطن سےواقف ہیں۔ اس طرز عمل سےدونوں اخباروں کے ایڈیٹروں نے اس مکروہ حرکت سے اپنا اور دیگر نام نہاد مسلمانوں کا دل خوش کرکے حضرت روح اللہ سے قساوت قلبی کا ثبوت دے دیا۔

مولوی ثناء اللہ صاحب بھول گئے کہ انگریزی ہفتہ وار اخبار پیرسن نےاپنی ۱۰ فروری ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں رسول عربی، بی بی عائشہ اور بلال کی تصاویر شائع کی تھیں جس پر ہندوستان کے طول وعرض میں کھرام مچ گیا تھا۔ تمام اسلامی جرائد نے(جس میں آپ بھی شامل تھے)۔ قیامت صغریٰ برپا کردی تھی۔ اس واویلا کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ گورنمنٹ نے اس اخبار کے مضمون کو ضبط کرلیا تھا۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کے دل مجروح ہوئے تھے۔ لیکن مسیحی کلیسیا عوام الناس میں زبردست ہیجان اور بے چینی پیدا کرکے گورنمنٹ سے سزا کا مطالبہ کرنے کا وطیرہ اختیار نہیں کرتی۔

لطیف طبع کولازم ہے سوزِ غم بھی لطیف
بلند آتش گل کا کبھی دھوآں نہ رہا

ہم اپنے آقا اور مولاربنا المسیح کے اسوہ حسنہ پر چل کرمرحوم مولوی ثناء اللہ صاحب اور آنجہانی مرزائے قادیانی کی ذیارت کے حق میں خدائے غفور الرحیم کی بارگاہ میں دست بدعاہیں کہ خدا ان سب کو معاف فرمائے اور وہ قعرِ مذلت سے نکل کر نجات ابدی حاصل کریں۔آمین ثم آمین۔

مرحوم مولوی ثناء اللہ صاحب حدیث کی حجیت کے قائل اور امام بخاری کے پجاری تھے۔ امام صاحب کی صح الکتب بعد از کتاب اللہ کے چوبیسویں پارہ کتاب اللباس میں چودہ حدیثیں موجودہیں جن میں تصویروں کی مذمت اور تصویر بنانے والوں کی سخت سزا کا ذکر ہے جس کو پڑھ کر بدن پر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔لکھاہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ" جس گھر میں کتا ہو یا تصویریں ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے "۔ اور کہ " جو لوگ تصویریں بناتے ہیں قیامت کے روز ان کو عذاب دیا جائے گا "۔ عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ " میں نے رسول اللہ سے سنا کہ سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن تصویریں بنانے والوں کو دیا جائے گا۔" مولوی صاحب نے تو یہ خیال کیا تھا کہ یہ مکروہ تصویر ان کی " نجات کا ذریعہ" ہوگی (صفحہ الف) لیکن مندرجہ بالا احادیث کی رو سے وہ جہنم کے شدید ترین عذاب کے مستحق ہوگئے۔ اس قسم کے ذووا الجھین قرآن وحدیث سے منحرف ہوکر یہ خیال نہ کریں کہ وہ مواخذہ خداوندی سے چھوٹ جائیں گے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبرائیل نے حضرت سے آنے کا وعدہ کیا اور بہت دیر ہوگئی۔ رسول خدا کو بڑا انتظار ہوا۔ آخر کار آپ گھر سے باہر نکلے تو وہاں جبرائیل ملے۔ آپ نے دیر سے آنے کی شکایت کی۔ جبرائیل نے کہا مجھے اس لئے گھر میں آنے کا تامل ہوا کہ جہاں تصویر ہو یا کتا ہو

وہاں ہم نہیں آتے"۔ جب رحمت کے فرشتے رسول اللہ کے گھر میں نہ گئے تو ان لوگوں کی کیا حقیقت ہے کہ ان کو جہنم کا شدید ترین عذاب نہ ملے گا؟ مولوی صاحب " اسلام اور قرآن مجید سے مدافعت "۔ (صفحہ الف) کا عاقبت نا اندیشی سے نرالہ طریقہ ایجاد کیا۔(صفحہ ۱۰۷) اور دوسروں کا شگون بگاڑنے کی خاطر اپنے لئے عاقبت کا عذاب مول لے لیا۔ اس میں وہ آنجہانی مرزائے قادیانی (غفر اللہ ذنوبہ) کے نقش قدم پر چلے ۔ (ریویو آف ریلجینس ۔ قادیان بابت فروری ۱۹۴۲ء صفحہ ۵۵) اور قرآن کو بھول گئے ۔ نَسُواْ اللّهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۔ وہ خدا کو بھول گئے ۔ پس خدا بھی ان کو بھول گیا۔ بے شک وہ فاسق ہوگئے۔ (سورہ توبہ آیت ۶۸)۔

سمجھائیں جائیں گے تمہیں ہر لحظہ ہر گھڑی
مانو نہ مانو اس کا تمہارا اختیار ہے

## مولوی ثناء اللہ اور مسیح کی دعائے مغفرت

مولوی ثناء اللہ صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں " مسیح کو دشمنوں نے ستایا اور آپ نے ایسے وقت میں معاف کیا جب کہ آپ بدلہ نہ لے سکتے تھے۔ مگر رسول عربی نے اپنے ظالم دشمنوں کو ایسی حالت میں معاف کیا جب کہ آپ ابروئے چشم کے ایک اشارے سے سب کا قتل عام کراسکتے تھے۔

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

(صفحہ ۱۶۵)

ہم اس بات سے قطع نظر کرتے ہیں کہ آپ نے حضرت روح اللہ کی شان میں یہاں اور صفحہ ۴۸ اور دیگر مقامات میں مرزائے قادیانی کی طرح سب وشتم روا رکھا ہے۔ مولانا کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسی شخص کی دعائے مغفرت خدا کے حضور قابل قبول اور انسان کے نزدیک قابل تحسین ہے جس میں بدلہ لینے کی خواہش اور طاقت ہو۔ اور اس کے باوجود وہ بدلہ نہ لے کلمتہ اللہ میں جذبہ انتقام تو نہیں تھا۔ کیونکہ آپ اس کو نہ صرف مکروہ بلکہ حرام سمجھتے تھے( متی ۵ باب ۔۱۸ باب ، مرقس ۱۱: ۲۵ وغیرہ) گو آپ بدلہ لینے پر قدرت او راختیار رکھتے تھے(متی ۲۶: ۵۳ ۔ یوحنا ۱۰: ۱۷۔ فلپیوں ۲: ۸ وغیرہ) پس آپ کی یہ شرط بھی پوری ہو گئی لیکن آپ کا مفروضہ جو اس اعتراض کی بنا ہے غلط ہے۔ دیکھئے جب رسول عربی اور مسلمانوں پر مکی زمانہ میں طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے تو آپ ان کو منجئی عالمین کا نمونہ دکھلا کر تسلی دیتے اور فرماتے " تم سے پہلے ایک نبی تھے۔ ان کی قوم نے اس کو اس قدر مارا کہ خون آلود کردیا اور وہ نبی اپنے منہ پر سے خون پونچھتے جاتے اور فرماتے جاتے تھے۔ اے اللہ میری قوم کی خطاؤں کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے "۔(بخاری جلد سوم صفحہ ۲۴۹) جب آپ کو جنگ اُحد میں کفار کے ہاتھوں شکست ملی اور آپ کا سر اور چہرہ زخمی کیا گیا اور آپ کے دانت توڑدئے گئے کیا آپ کا صبرو برداشت اس زمانہ میں آپ کے فارسی شعر کے مصداق تھا اور آپ کی تواضع " گدایانہ " تھی؟

مولوی صاحب غلط فرماتے ہیں کہ رسول عربی نے فتح مکہ کے روز اپنے دشمنوں کو معاف کیا۔ اس روز آپ نے سیاسی تدبیر اور دور اندیشی سے کام لے کر ساکنین مکہ کو پناہ دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے بد ترین دشمنوں کو معاف نہیں کیا تھا بلکہ ان خون ہدر کردیا اور حکم دیا تھا کہ ان کو جہاں پاؤ مار ڈالو۔ ان دشمنوں میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھیں ۔ کیاآنحضرت نے جنگ بدر کی فتح کے بعد ابوجہل، نضر بن حارث، عقبہ بن معیط، وغیرہ بد ترین دشمنوں کو معاف کردیا تھا؟ کیا کعب بن اشرف، حئی بن اخطب ، سلام بن ابی الحقیق وغیرہ معاف کئے گئے تھے؟ کیا یہود کے قبیلہ بنی قریظہ کے تمام مرد قتل نہیں کئے گئے تھے ؟ اگر مولوی صاحب تاریخ محمدی سے اس درجہ ناواقف ہیں تو ہم ان کی توجہ مشارق الانوار کی احادیث نمبری ۸۷۸، ۸۷۹، ۱۸۱۴، ۱۸۹۱، ۱۸۹۲، وغیرہ کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ مولوی صاحب ضرور ان واقعات سے واقف ہیں۔ لیکن اپنے فتویٰ کو بھول گئے کہ

" منصف مزاج لوگ مذہبی مباحث میں خاص کر اخفائے واقعات کرنا جرم عظیم سمجھتے ہیں"(صفحہ ۲۳)۔

انجیل جلیل اور بخاری شریف دونوں حضرت ابن اللہ کی دعائے مغفرت کا ذکر کرتی ہیں جو آپ نے اپنے دشمنوں کے حق میں کی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اب بھی آسمان پر مرحوم مولوی صاحب جیسے دشمنوں کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ ہماری بھی یہی دعا ہے کہ خدا مرحوم کے گناہوں کو معاف فرمائے اور اس پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

اللھمہ المفتح علیہ ابواب رحمتکہ

ہنری مارٹن اسکول
علی گڑھ
۲۵ مارچ ۱۹۵۷ء

(برکت اللہ)